إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جون ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

محمد وقاص

'اسلامی سکول' دین کی خدمت کر رہے ہیں

البرہان مئی کے شمارے میں محترم محمد ڈاکٹر امین صاحب کا مضمون اسلامی سکول کیوں ناکام ہیں، دیکھا ۔فاضل مصنف نے اختلاف رائے کا حق دیتے ہوئے البرہان کا پلیٹ فارم پیش کیا جو ان کی وسعت ظرفی اور وسیع المشربی کی دلیل ہے۔ یہ تحریر بڑے درد سے لکھی گئی ہے لیکن اس درد کی شدت نے اسے راہ اعتدال سے ہٹا کر مائل بہ افراط کر دیا ہے۔ پہلا تاثر تو یہ ہے کہ اسلامی سکولوں کے عنوان سے تحریر لکھ کر ملک میں چلنے والے اقلیتی اشرافیہ کے سیکولر، الحاد پسند اور اباحیت فروغ اداروں کا سارا نزلہ بیچارے اسلامی سکولوں پر نکالا گیا ہے۔ گویا فاضل مصنف ملک بھر میں جاری اسلامی طرز کے سکولوں میں جاری سرگرمیوں سے یا تو باخبر نہیں یا مغربی تہذیب ہی سے سرے سے نابلد ہیں اور محض چند ظاہری علامات دیکھ کر ہر نئی چیز پر بن دیکھے اور پرکھے مغربی تہذیب کا ٹھپہ لگا رہے ہیں۔ یہ بات بھی کہی گئی کہ دلیل کی بنیاد پر موقف بیان کیا جا رہا ہے لیکن یہ ایک خاص نکتہ نظر یا زاویہ نظر تو ہے لیکن از قسم دلیل کوئی چیز ہمارے ہاتھ نہیں آئی ۔

ابتدا میں دو اصولوں کی بات کی گئی ہے۔

۱۔تعلیم کے عناصر ترکیبی کی اسلامی تناظر میں تشکیل جدید

۲۔مغربی نظام تعلیم کا کلی انکار

جہاں تک پہلے اصول کا تعلق ہے اس کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس بارے میں اب تک جو کام کیا جا سکا ہے وہ اس کے مقابلے میں بہت کم ہے جتنا کہ کیا جانا چاہیے تھا ۔۔۔۔لیکن جو کچھ کیا جا چکا ہے یا کیا جا رہا ہے اس کی اہمیت و افادیت سے انکار کسی طور بھی قرین انصاف نہیں ہوگا۔

اس کام کے دو پہلو قابل ذکر ہیں ایک سلبی پہلو ہے جس کے تحت موجودہ رائج نصاب ہائے تعلیم کے تجزیہ و تحلیل کا عمل ہے جو مختلف سطحوں پر جاری ہے۔ جس کی مثال خالد جامعی صاحب کا مضمون بھی ہے ۔۔اس باب میں تنظیم اساتذہ پاکستان بھی قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

دوسرا پہلو ایجابی ہے اس لحاظ سے بھی مختلف ادارے سرگرم عمل ہیں اور مختلف تجربات کر

رہے ہیں جن میں ایک ادارہ آفاق کا بھی ہے ۔۔ لیکن یہ کام ابھی ابتدا ہے اور بکھرا ہے جسے مجتمع کرنے اور مزید موثر بنانے کی ضرورت ہے ۔

جہاں تک دوسرے اصول یعنی مغربی نظام کے کلی انکار کا تعلق ہے اس کے لیے کسی مضبوط شرعی دلیل کا سہارا لینے کے بجائے محض مغرب کی شدید نفرت میں نفی واثبات کا مسئلہ چھیڑا گیا ہے ۔حالانکہ عقائد کی دنیا کے اس مسئلے کا یہاں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا اور نہ ہی کسی معاصر تہذیب کا کلی انکار سنت سے ثابت ہے ۔۔نہ

ہی کسی قوم کی دشمنی اس بات کے لیے کافی جواز ہے کہ حد اعتدال کو عبور کر دیا جائے فرمایا لا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب لتقوی

اس کے بعد اسلامی سکولوں کے لیے جو نسخہ تجویز کیا گیا ہے اس کے مطابق

☆تعلیم کو تجارت نہ سمجھا جائے

☆انگریزی میڈیم سے باز آیا جائے

☆مخلوط تعلیم سے نجات حاصل کی جائے

☆غیر ملکی نصاب ترک کیا جائے

☆موجودہ ہم نصابی سرگرمیوں اور یونیفارم کا بائیکاٹ کیا جائے

اس نسخہ کیمیاء پر اگر عمل کیا جائے (سوائے مخلوط تعلیم کے جسے معاشرے نے من جملہ مسترد کردیا ہے) تو اس کا سادہ مطلب یہ ہے کے یہ ادارے خودبخود بند ہوجائیں گے ۔

بصورت دیگر ان اداروں کے سربراہان کو مشورہ دیا جا رہا ہے کے ادارے بند کر دئے جائیں اور اپنے لیے کوئی اور روزگار ڈھونڈ لیں ۔گویا دونوں صورتوں میں فاضل مصنف کا مقصد یہ ہے کے یہ ہزاروں ادارے بند ہوجائیں (شائد یہ ادارے ہی خرابی کی اصل جڑ ہیں)۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ اسلامی تعلیمات ۔عقل اور شعور کے حوالے سے کوئی اچھی رائے ہے ۔

یقینا ایسا نہیں ہے ۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آج کے تعلیمی اداروں میں جو کچھ ہے وہ سب ٹھیک ہے ۔۔یہ مقدمہ بھی اتنا ہی غلط اورتفریط پر مبنی ہے جتنا کے پہلا مقدمہ کہ وہاں سب کچھ غلط ہے اور ان کو بند کر دینا بہتر ہے ۔

اب آئے سب سے پہلے تو اس نسخہ کو لیتے ہیں جس کو بطور علاج پیش کیا گیا ہے۔

☆تعلیم کو تجارت نہ سمجھا جائے۔

یہ بات بظاہر بڑی موزوں لگتی ہے ۔ لیکن غور کیا جائے تو اس کے مضمرات بڑے بھیانک ہیں ، پھر اساتذہ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تنخواہ نہ لیں ۔۔ مالک مکان سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ عمارت کا کرایہ وصول نہ کرے ،حکومت سے مطالبہ کیا جائے کے وہ ٹیکس اور بجلی گیس کے بل وصول نہ کرے اوراسی پربس کیوں ۔۔ البرہان کو چھاپنے کے لیے کاغذ مفت حاصل کیا جائے ۔مفت طباعت کرائی جائے کہ اس کی اجرت دینا ٹھیک نہیں اور عملہ کو تنخواہ بھی نہ دی جائے اور پھر مفت تقسیم کیا جائے ۔۔۔نہ کہ یہ اشتہار دیا جائے کہ رسالہ خرید کر پڑھیں ۔۔لیکن اگر ایسا نہیں ہے

اور یقینا ایسا نہیں ہے ۔اور ہر ایک کو اس کی جائز اجرت دینا ضروری ہے تو پھر اکیلے سکول کے سربراہ کے لیے یہ طعنہ کیوں (جو اپنی محنت، بہترین صلاحیت اور سرمایہ ایک کام میں لگاتا ہے) کہ تم پیٹ پالنے کے لیے کوئی اور کام کرو ۔۔۔

☆مخلوط تعلیم سے نجات

مخلوط تعلیم یقینا ترک کر دینی چاہیے ۔ہمارا معاشرہ اس پر قریبا یکسو ہے اور اس کے تباہ کن مضمرات سے آگاہ ہے لیکن محض اس کی وجہ سے کہ کسی جگہ یہ سہولت میسر نہیں طالبات کو تعلیم سے روکنا بھی از روئے عقل وشرع درست نہیں ہے ۔

☆انگریزی میڈیم سے باز آیا جائے ☆غیر ملکی نصاب ترک کیا جائے

اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آج تعلیم کے خدوخال کو سمجھا جائے۔آج تعلیم کو بنیادی طور پر چار شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

فنیات کی تعلیم

لسانیات کی تعلیم

عمرانیات کی تعلیم

دینیات کی تعلیم

فنیات اور لسانیات کے بارے میں اسلام کا رویہ قطعا غیر متعصّبانہ ہے ۔۔جس طرح ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست کا نظریہ ہے اسی طرح کوئی بھی جدید تحقیق ،ایجاد اور دریافت اصلا حلال ہے جب تک کہ اس کے حرام ہونے کے لیے نص صریح موجود نہ ہو ۔ لہذا غیر ملکی نصاب کا وہ حصہ جو جدید تحقیق و اکتشاف پر مشتمل ہے محض اس لیے ترک کر دینا کہ غیروں کا مرتب کردہ ہے محض جہالت ہے ۔

اسلام کے نکتہ نظر سے ساری زبانیں اللہ کی نشانیاں ہیں ان میں سے بذات خود کوئی بھی اسلام کے خلاف نہیں ہے ۔۔۔اس کی سب سے بڑی مثال خود عربی زبان ہے جو زمانہ قبل از اسلام کفر اور شرک کی زبان تھی ۔ اس کی تاریخ اس کی ثقافت اس کا شعر اور اس کی قصہ گوئی میں کفرو شرک ،فسق وفجور اور فحاشی رچی بسی ہوئی تھی ۔۔۔ اللہ تعالی نے اسی زبان میں قرآن نازل کر کے اس کو اسلام کی زبان بنا دیا اور آج عربی کا اس کے علاوہ کوئی اور تعارف نہیں ہے ۔لہذا انگریزی سے اس لیے نفرت کے یہ انگریز کی زبان ہے یا اس میں فسق اور فجور ہے اسلام کے آفاقی نظریہ سے نابلد ہونے کی کھلی دلیل ہے ۔انگریزی تہذیب اور کے پیش کردہ

افکار اور نظریات کی مخالفت بجا لیکن اس بہانے انگریزی زبان کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لینا یا اس کے مقابلے میں اردو زبان کو مذہبی تقدس دینا محض ایک واہمہ ہے ۔۔۔ اگر تعلیم مادری زبان میں دینا ضروری ہے تو پھر تو اس کے لیے پنجابی ،سندہی بلوچی اور پشتو زیادہ موزوں زبانیں ہیں ۔(اس کو اردو کی مخالفت یا اس کی اہمیت کم کرنا نہ سمجھا جائے ۔ اردو پاکستان کی وحدت کی علامت ہے اور اس پر پوری توجہ ضروری ہے ۔)

اسلام کا اس لحاظ سے غیر متعصب ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فنیات اور لسانیات کی تعلیم کے لیے غیر مسلم استاد کی خدمات کا حصول بھی سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے ۔

☆موجودہ ہم نصابی سرگرمیوں اور یونیفارم کا بائیکاٹ کیا جائے ۔

اسلام کسی خاص وضع قطع کا نام نہیں ۔۔۔ یہ ممکن نہ تھا کہ روم کے صہیب فارس کے سلمان حبش کے بلال اور مکہ کے مصعب کا لباس کے حوالے سے ایک ہی ذوق ہو ۔لہذا کسی ایک لباس کو اسلامی قرار دینا اسلام کی آفاقیت پر ایک بہت گہری ضرب ہے جو محض لاعلمی اور جہالت میں مسلمانوں کے ہی ہاتھوں اسلام پر لگائی جارہی ہے

پس چہ باید کرد راہ اعتدال کیا ہے؟؟؟

اصل مسئلہ کیا ہے

اصل مسئلہ نصاب اور کتاب یا زبان کا نہیں ہے ۔۔ یہ اہم اور ضروری چیزیں ہیں لیکن ان کی باری بعد میں آتی ہے بلکہ

اصل مسئلہ ایک صحیح العقیدہ مسلم استاد کی تیاری ہے ۔

اگر استاد ٹھیک ہے تو اسے کوئی بھی نصاب تھمادیں وہ نئ نسل کی تربیت انہی خطوط پر کرے گا جو درست ہونگی ۔ مثال کے طور پر نصاب بے شک وہی ہو جس کی طرف ا سی شمارے کے ایک دوسرے مضمون میں سید خالد جامعی نے اشارہ کیا ہے ۔۔لیکن جب اسی نصاب کو ایک مسلمان استاد پڑھائے گا تو وہ نسل نو کو اس کے زہر سے نہ صرف بچائے گا بلکہ ان کے ذہن میں ان چیزوں کے لیے نفرت پیدا کرے گا ۔اس کے سامنے جب میاں بیوئی اور دو بچوں کا ذکر ہوگا تو وہ دادا دادی اور نانا نانی کی بات خود نکالے گا اور اسی بہانے مغرب پر تنقید بھی کرے گا اس کے برعکس اگر ایک غلط فکر کے استاد کے ہاتھ میں قرآن بھی تھما دیں تو وہ نسل نو کے ذہن شکوک وشبہات سے بھر دے گا ۔۔۔ اس کا تجربہ اور مشاہدہ موجود ہے ۔

لہذا پہلی ضرورت اساتذہ کی تربیت ہے ۔استاد کی تربیت میں جہاں ایمان اور اخلاق کے راسخ علم کو بنیاد بنایا جائے وہیں اس تجزیاتی اور تحلیلی مطالعہ کو بھی اس تربیتی

نصاب کا حصہ بنایا جائے جو اس فاسد نصاب تعلیم پر تحقیق کی صورت میں کیا گیا ہے تا کہ ایک استاد اس زہر سے خوب واقف ہو جس کا اسے تریاق کرنا ہے ۔

دوسری ضرورت نصاب کو تدریجا اسلامیانے کی طرف پیش قدمی ہے اس کے لیے درج ذیل اصولوں کو پیش نظر رکھنا عقل وشرع کا تقاضا ہے

☆ طالب علم کو دین کا واضح تصور دیا جائے اور مسلمہ عقائد خوب اچھی طرح اس کے ذہن نشین کرائے جائیں

☆ طلبا وطالبات کو اسلامی اخلاق کا علمی اور عملی درس دیا جائے ۔

☆ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے ،لہذا یہ جہاں سے بھی ملے بلا تامل لے لی جائے ۔ جدید علوم ،تحقیقات اور تجربات سے بھرپور استفادہ کیا جائے

☆ طلبا وطالبات کو اورسب سے بڑھ کر خود اساتذہ کو اس قابل بنایا جائے کہ خذ ماصفا ودع ما کدر جو صاف ستھری چیز ہے اسے لے لیا جائے اور ایمان اور اخلاق کی رو سے جو چیز آلودہ ہے اسے چھوڑ دیا جائے ۔(درج بالا سطور راقم کی ذاتی رائے ہے اسے جماعت اسلامی کا موقف نہیں سمجھنا چاہیے)

محمد وقاص خان ۔ رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان ۔واہ کینٹ

پروفیسر ملک محمد حسین

اسلامی سکول واقعی ناکام ہیں؟

ڈاکٹر محمد امین صاحب نے البرہان کے مئی 2014ء میں 'اسلامی سکول کیوں ناکام ہیں؟' موضوع پر اپنے خیالاتِ عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک عرصے سے تعلیمی موضوعات کے نہایت ہی اہم پہلوؤں پر بہت ہی وقیع مقالات اور کتب تحریر کر رہے ہیں۔ موصوف کی فکر اس بات کی غماز ہے کہ وہ تعلیم کے مسئلہ پر بڑی جانفشانی سے غور کرتے ہیں اور اسلامی تناظر میں نہایت اہم، قابل قبول اور قابل عمل لائحہ عمل سامنے لاتے ہیں۔ آپ ایک عرصے سے نئی طرز کے اسلامی مدارس، نئی طرز کے سکول اور نئی طرز کی یونیورسٹیوں پر لکھ رہے ہیں اور ان سب میں نئی طرز سے مراد اُن کی اسلامی تناظر میں ایسے ادارے ہیں جو آج کے معاصر اسلامی معاشرے میں مطلوب ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے "اسلامی سکول کیوں ناکام ہیں؟" کے موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے بہت حد تک اتفاق کے باوجود کہیں کہیں اختلاف کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ ان کے اس مضمون پر محترم محمد وقاص خان رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان نے بھی اپنی ذاتی رائے کے حوالے سے ناقدانہ رائے زنی کی ہے۔ جناب محمد وقاص خان کا مضمون بھی شاید البرہان کے اسی شمارے میں شائع ہو رہا ہے۔ میں اپنی عاجزانہ رائے کی روشنی میں دونوں حضرات کے مضامین پر نظر ڈالوں گا۔ دونوں فاضل مضمون نگاران پر رائے زنی سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی نظامِ تعلیم اور اس کی روشنی میں قائم ہونے والے سکولوں کے خدوخال پر مختصر سی گفتگو کر لی جائے تا کہ دونوں حضرات کے مضامین پر رائے زنی کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

نظامِ تعلیم

کسی بھی نظامِ تعلیم میں بنیادی بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے معاشرے کے نظریۂ حیات، اقدار اور روایات نئی نسل کو منتقل کرنے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا گیا ہے، اس کے لیے کیا وسائل کام میں لائے جا رہے ہیں اور اس کے مؤثر نفاذ کے لیے کیسا ماحول پیدا کیا گیا ہے؟ نظامِ تعلیم اگر بامقصد ہو یعنی اس کے مقاصد واضح ہوں۔ اس سے جس طرح کے پراڈکٹ یعنی انسانِ مطلوب پیدا کرنا پیش نظر ہو اس کا ناک نقشہ واضح ہو نیز معاشرے کے تسلسل یا تشکیل نو کے اہداف مقرون اور قابلِ حصول ہوں تو ایسے نظامِ تعلیم کے نتائج یقینی اور قوی ہوں گے۔ اس کی ایک مثال میں امریکی نظام کی دوں گا۔ امریکہ

میں پوری دنیا کے تارکین وطن آتے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ ان میں برطانوی بھی شامل ہیں اور فرانسیسی بھی۔ اُن میں ہسپانوں بھی موجود ہیں اور جرمن بھی۔ مشرق سے پاکستانی، بھارتی، کمبوڈین، ویت نامی، چینی، کورین، ایرانی، افغانی، لبنانی، عراقی اور مصری غرض ہر علاقے اور ہر قومیت سے لوگ تارکین وطن کی شکل میں امریکہ میں وارد ہوتے ہیں۔ تارکین وطن تو کچھ عرصے تک اپنے سابقہ قومی کردار، راویات اور عادات کو قائم رکھتے ہیں لیکن ان کے بچے جب سکولوں کالجوں میں داخل ہوتے ہیں تو ابتدائی تعلیم کے حصول کے ساتھ ہی وہ امریکن بن چکے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے معمولات کے برعکس وہاں تارکین وطن کی اولادیں اپنی سابقہ شناخت بالکل ختم کر کے نئی امریکن شناخت میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہ سارا عمل امریکہ کے نظامِ تعلیم کی قوت کا مظہر ہے کہ جو اپنے سانچے میں ڈھال کر یک رنگ ثقافت اور ہم رنگ قوم کو جنم دیتا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم بھی اگر اپنی پوری ساخت دپرداخت اور جامع نفاذ کے ساتھ بروئے کار آئے تو اس کا پراڈکٹ بھی اسلام کا انسان مطلوب ہوگا۔ اسلام کا نظامِ تعلیم رسمی طور پر نافذ کیا جائے یا غیر رسمی طور طریقوں سے بروئے کار آئے نتیجہ ہمیشہ اسلام کا انسانِ مطلوب ہوگا۔ اس دعوٰی کی تصدیق ہمیں اسلام کے دورِ اولین سے ملتی ہے۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاگردانِ رشید صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلیم حاصل کر کے چند ہی سالوں میں جاہلیت کاملہ سے تبدیل ہو کر قرآن اور سیرت طیبہ کی روشنی میں اسلام کے انسانِ مطلوب بن گئے تھے۔ اگر ہم قرآن سے پوچھیں کہ اس رسمی اور غیر رسمی تعلیم کا نصاب کیا تھا تو چار مختلف مقامات (سورہ البقرہ، سورہ الانفال، سورہ الاعراف میں) اس نصاب کے خدو خال ملتے ہیں۔ اس نصاب کا پہلا عنصر تھا تلاوتِ آیات، دوسرا تھا تعلیم کتاب، تیسرا تھا تعلیمِ حکمت اور چوتھا جزو تھا تزکیہ نفس، اس نصاب کو شاگردوں کو منتقل کرنے کی ذمہ داری تھی معلم اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو خود اپنے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ **انما بعثت معلماً** یعنی بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

نصابِ نبوی کے پہلے دو حصے یعنی تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب تو قرآن مجید کے متن سے متعلق ہیں تیسرا حصہ جو تعلیم حکمت سے متعلق ہے وہ تعلیم کتاب کو اساس بناتے ہوئے زندگی کے پیچیدہ، انتظامی، سیاسی، بین الاقوامی تعلقات، عسکری اور عوامی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ چوتھا جزو جو تزکیہ نفس سے متعلق ہے اس کی بنیاد بھی قرآن کی تعلیمات ہیں لیکن اُسے علیحدہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معلم قرآنی تعلیمات کا اطلاق کرتے ہوئے نیز اپنی سیرت اور ذاتی نمونہ سامنے لاتے ہوئے سیرت وکردار کی پاکیزگی اور فکر وعمل کی درستی کو یقینی بناتا ہے۔

اگر اس پوری صورتِ حال پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ اس کائنات کے عظیم ترین معلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی اپنا معلمانہ کردار احسن طریقے سے نبھانے کے لیے اللہ رب العزت نے تشکیل کردہ

نصاب (Structured Curriculum) دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ حقیقی کے نزدیک جہاں معلم کی اہمیت بہت زیادہ ہے وہاں نصاب کی اہمیت بھی کم نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ انسانیت کو اس کائنات کا عظیم ترین معلم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دے کر کہتا کہ نصاب کی جو پرانی کتابیں از قسم انجیل، تورات اور زبور وغیرہ موجود ہیں، انہی سے کام چلاؤ، انہیں تنقیدی نکتہ نگاہ سے بڑھاؤ اور ان کی غلطیوں خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے درست علم، درست رویے اور درست اعمال کی اپنے شاگردوں کو تلقین کرو۔

سطورِ بالا میں ہم نے جو معروضات پیش کی ہیں اُن سے ہماری نظر میں اسلامی نظامِ تعلیم کے جو خدوخال نمایاں ہوتے ہیں اُن میں قرآن حکیم کی تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ اسوۂ حسنہ کی تعلیم دوسرا اہم ترین جزو ہے بلکہ قرآن حکیم کی تعلیم کے فہم کے لیے اسوۂ حسنہ بنیادی وسیلہ ہے۔ تزکیہ نفس تعلیم کا ایسا جزو ہوگا جو انسانی جسم میں دوڑتے ہوئے خون کے مصداق پورے تعلیمی لوازمہ، تعلیمی ماحول اور معلم کی ذاتی شخصیت اور کردار کا مظہر ہوگا۔

رہ گئی تعلیمِ حکمت تو زندگی میں کام آنے والے مختلف افعال، معاصر احوال و مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے تدبیری اور تزویراتی مہارت نیز سماجی، سائنسی اور تکنیکی میدانوں میں کام کرنے کی صلاحیت جو قرآن حکیم اور سیرت طیبہ کی تعلیمات کی روح لیے ہوئے ہو۔ اس میں پوری دنیا کے انسانوں کے سماجی، سائنسی اور تکنیکی تجربات کو کام میں لایا جاسکتا ہے بشرطیکہ کوئی چیز قرآن وسنت کی واضح تعلیمات سے ٹکراتی نہ ہو۔ تعلیمی نظام میں نصاب اور استاد کے ساتھ ماحول اور رول ماڈل کی بہت اہمیت ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں تو ان دو عناصر کی اہمیت کا انکار کسی طور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ذرا آپ قرونِ اولیٰ کے تربیتی نظام پر نظر ڈالیں یہ دونوں عناصر بڑے نمایاں نظر آئیں گے۔ مضمون کی طوالت کے خوف کے پیشِ نظر ہم یہاں ان کی تفصیل سے گریز کر رہے ہیں۔

اسلامی نظامِ تعلیم کا ایک اور اہم عنصر یہ ہے کہ پوری اسلامی تعلیمی روایت میں طالب علم سے مصارفِ تعلیم لینے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ طلباء سے فیس لینے کا دھندا مسلم دنیا کی کولونائزیشن (Colonization) کے بعد شروع ہوا اور اب نام نہاد آزادی کے بعد ہم خود اس کو جاری رکھنے بلکہ اس خرابی کو بڑھانے کے ذمہ دار ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ نگاہ سے وضاحت کرنا چاہیں گے وہ یہ کہ ایک حدیث کے مطابق تمام مسلمانوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے، اسلام کے نظامِ زندگی میں جس چیز کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے اس کے حصول پر فیس کیسے لی جاسکتی ہے؟ ذرا آپ نماز کی فرضیت کو دیکھیں۔ کیا مساجد میں نماز پڑھنے کے لیے نمازیوں سے فیس لی جاسکتی ہے؟ اگر نمازیوں پر فیس عائد کردی جائے تو جو خواتین وحضرات اپنی مالی مجبوری کے باعث فیس ادا نہیں کر پائیں

گے کیا نماز اُن سے ساقط ہو جائے گی؟ ظاہر ہے یہ ساری بات ہی لغو ہے اور کوئی بھی شخص نماز کی ادائیگی پر فیس عائد کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ جس طرح نماز فرض ہے اور اس پر فیس عائد نہیں کی جاسکتی اسی طرح چونکہ تعلیم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اس لیے تعلیم کے حصول پر اسلامی معاشرے میں فیس عائد نہیں کی جاسکتی۔ مزید وضاحت کے لیے ہم دیگر بعض عبادات کا ذکر مفید خیال کرتے ہیں کہ جن پر مصارف اٹھتے ہیں مثلاً حج پر اخراجات آتے ہیں لہٰذا حج تمام مسلمانوں پر بلا تخصیص فرض نہیں ہے۔ یہ صرف اُن خواتین وحضرات پر فرض ہے جو حج کے مصارف ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی فرض ہے لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جو صاحبِ نصاب ہوں۔ یہ فرض سب پر بلا تخصیص لاگو نہیں ہوتا۔ فرض عبادات کے اس اجمالی ذکر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی کام سب مسلمانوں پر بلا تخصیص فرض ہے تو اس کی ادائیگی پر اخراجات کی وصولی غیر اسلامی ہے اور اگر کسی فرض کی ادائیگی پر اخراجات اٹھتے ہیں تو اس کی ادائیگی صرف اُن پر فرض ہے جو ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہوں۔ ہماری اس بحث سے واضح ہے کہ تعلیم کے میدان میں طلبہ سے فیس وصول کرنا غیر اسلامی ہے۔ اگر ہم پاکستان کے آئین کی دفعہ 37 کو غور سے پڑھیں اور اس کا اس کی روح کے مطابق اطلاق کریں تو اسلام کی یہ منشا پوری ہو جاتی ہے کہ طلبہ سے مصارفِ تعلیم وصول نہ کیے جائیں۔ رہ گئی پرائیویٹ اداروں کی تعلیم تو کم از کم فیسوں کی وصولی کی حد تک یہ سب ادارے غیر اسلامی حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ ہمارے ملک میں اعلیٰ سرکاری تعلیمی ادارے عموماً اور ہر سطح کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے خصوصاً اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی واضح شقوں اور اسلامی نظام تعلیم کے ناقابلِ تردید تصورات کے برخلاف فیسیں کیوں وصول کرتے ہیں نیز لبرلز اور سیکولر اداروں کو ایک طرف رکھیں خود اسلامسٹوں کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی ادارے دھڑلے سے فیسیس وصول کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی کراہت اور شرمندگی کے۔ بلکہ ہمارے بعض پر جوش اسلامسٹ بھائی تو اسے کارِ ثواب سمجھتے ہیں کہ بھاری فیسوں والے پوش تعلیمی ادارے قائم کر کے وہ معاشرے کی اشرافیہ اور دولت مند طبقوں کی اولادوں کو (ان کے خیال میں) لبرل اور سیکولر تعلیمی اداروں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم بات کو مختصر کرتے ہوئے اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال چند نکات کی شکل میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ قرآن حکیم کی تدریس تلاوتِ آیات کے طور پر لازمی ہوگی۔

۲۔ تعلیم کتاب یعنی قرآن حکیم کا ترجمہ (ہم غیر عربوں کے لیے) اور اس کا فہم

(Understanding) درجہ بدرجہ نصاب تعلیم کا لازمی حصہ ہوگا۔

۳۔ تزکیہ نفس کا اہتمام تمام تعلیمی ادارے تمام درجات میں لازماً کریں گے۔ تزکیہ نفس کی بنیاد قرآن مجید کی تعلیمات اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زندگی گزارنے کے نمونے، معلمین کا شخصی رول ماڈل اور تعلیمی ادارے کی سرگرمیاں اور ماحول ہوں گے۔

۴۔ پہلے تین عناصر جو اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ نصاب تعلیم کا لازمی حصہ ہوں گے یعنی جسے جدید اصطلاحوں میں (Core Curriculum) کہتے ہیں

۵۔ قرآن وسنت کی روح سے سرشار تعلیم حکمت جس میں تمام علومِ آلیہ یعنی سوشل سائنسز، نیچرل سائنسز، ٹیکنالوجی، حکومت کاری، مالی علوم، عسکری علوم، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ شامل ہوں گے۔ ظاہر ہے سب علوم سب کے لیے لازمی نہیں ہوں گے بلکہ معاشرے کی ضرورت اور فرد کے رجحان طبع کے مطابق ان علوم کی تقسیم اور تحصیل ہوگی۔ نصاب کا یہ شعبہ اختیاری (Optional) اور انتخابی (Elective) حصہ کہلائے گا اور اس میں عصری تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں لائی جاتی رہیں گی۔

۶۔ نظام تعلیم کی کسی بھی سطح پر کوئی فیس نہیں لی جائے گی اور تعلیم مہیا کرنے کی ذمہ داری ریاست اور دیگر اجتماعی سماجی اداروں کی ہوگی۔ تعلیم مہیا کرنے کی خاطر ریاست اور دیگر اجتماعی قانونی ادارے شہریوں سے اُن کی استطاعت کے مطابق تعلیمی ٹیکس لے سکتی ہے۔

۷۔ ہر سطح کی تعلیم میرٹ کا لحاظ رکھتے ہوئے بلا تمیز سب کے لیے یکساں، اور سب کے لیے مفت ہوگی۔

۸۔ کسی بھی سطح پر مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں ہوگی۔

۹۔ ترجیحاً لڑکیوں کو خواتین اساتذہ تعلیم دیں گی اور لڑکوں کو مرد اساتذہ۔

۱۰۔ اس نظام تعلیم میں معلم کی حیثیت مرکزی ہوگی۔ اس کی تعلیم، شخصی کردار بہترین ہوگا اور معاشرے میں اس کی سماجی حیثیت اور معاشی حیثیت درجہ بدرجہ سب سے بلند رکھی جائے گی۔

۱۱۔ ضلعی، صوبائی اور وفاقی سطح پر تعلیمی محتسب کا ادارہ ہوگا جو تعلیم کے معیار، تعلیم کے اسلامی تشخص، اساتذہ کا معیار، اساتذہ کے حقوق وفرائض اور ان کی مراعات پر نظر رکھے گا اور اس سلسلہ میں عدل کا بہترین نظام قائم کیا جائے گا۔ اساتذہ کو انجمنیں بنا کر ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی اجازت نہیں ہوگی تاہم پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے لیے مضمون دار یا درجہ دار تعلیمی انجمنیں بنانے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

نظام تعلیم کے چند بنیادی عناصر کو مختصراً بیان کرنے کے بعد ہم ڈاکٹر محمد امین صاحب کے مضمون " اسلامی سکول ناکام کیوں ہیں؟" اور اس پر جناب محمد وقاص خان کے تبصرہ کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پہلے محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کے مضمون پر نظر ڈالتے ہیں۔

میرا پہلا اعتراض تو اسلامی سکول کی اصطلاح پر ہے۔ڈاکٹر صاحب محترم جن کو ناکامی کا طعنہ دے کر اسلامی سکول کہہ رہے ہیں وہ محض سکول ہیں اور انہیں اسلامی سکول کہنا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر وہ سکول ہیں جو (بزعم خود) اسلامی ذہن کے لوگ انفرادی یا چین(Chain) کی شکل میں چلا رہے ہیں۔ان میں حرا سکولز، دارِارقم سکولز، فاران سکولز، یقین ماڈلز سکولز، دعوہ ماڈل سکولز، منہاج القران ماڈل سکولز، غزالی سکولز، عثمان سکولز، ہلال سکولز، علامہ اقبال ماڈل سکولز، ریڈ فانڈیشن سکولز اور انفرادی سطح پر چلائے جانے والے ہزاروں سکول شامل ہیں۔

ان سب سکولوں کے مالکان اور منتظمین کا دعویٰ ایک طرف لیکن انہیں اسلامی سکول کہنا "اسلامی" کی اصطلاح کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ان میں سے اکثر اداروں میں نصاب اور کتابیں سیکولر ہیں، ماحول اسلامی سابقے کے ساتھ سیکولر ہے۔ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم کی طرح اسلامی سابقے کے ساتھ وہی ہیں جو نام نہاد لبرل پوش سکولوں میں ہوتی ہیں۔ اساتذہ کی شخصی سیرت وکردار کی حالت کم از کم الفاظ میں تسلی بخش نہیں ہے۔ اساتذہ کے مشاہرے شرمناک حد تک کم ہیں۔ بہت سے تعلیمی اداروں کی فیسیں شرمناک حد تک زیادہ ہیں۔ ایسے سکول بھی ہیں جو ائیر کنڈیشنڈ کلاس رومز میں حفظِ قرآن کی کلاسیں چلاتے ہیں اور کافی اونچی فیس لیتے ہیں، ثواب کے اس احساس کے ساتھ کہ وہ امیر گھرانوں کے بچوں کو ان کا مطلوبہ ماحول دے کر حفظِ قران سے مستفید کرنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ وہ خود جو لاکھوں کماتے ہیں اس کے خاکسارانہ ذکر کے ساتھ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کن بنیادی اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کے ساتھ معاشرے میں امارت اور غربت پر مبنی امتیازی کلچر پیدا کر رہے ہیں۔

نام نہاد اسلامی سکولوں کے حوالے سے ایک اور پہلو جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ یہ سکول جو پراڈکٹ ہمیں دے رہے ہیں وہ کیا اسلام کے انسان مطلوب کے مطابق یا اس کے قریب کی کوئی چیز ہے۔ اَسّی کی دہائی سے اب تک کم از کم تیس سال ہو چکے ہیں جب سے پرائیویٹ سکولوں کی کثیر تعداد نے کام کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر محمد امین صاحب کی اصطلاح اسلامی سکولوں کی ہزاروں کی تعداد سے لاکھوں طلبہ فارغ ہو کر معاشرے میں آ چکے ہیں لیکن معاشرتی زندگی میں کیا کوئی تبدیلی نظر

آتی ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جواب نفی میں ہے۔ اسلامی قوتیں پسپا ہو رہی ہیں حتیٰ کہ ان آبادیوں میں بھی جہاں اسلامسٹوں کے تعلیمی اداروں کی قابل ذکر تعداد موجود ہے اور ان میں پڑھنے والے بچوں کے والدین اور لواحقین کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

ہماری نظر میں ڈاکٹر محمد امین صاحب جن سکولوں کو اسلامی سکول کہہ رہے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ملغوبہ سکول (Hybrid School) کہلائے جا سکتے ہیں جو اکسفورڈ کے سلیبس کی تدریس کے ساتھ چند اسلامی دعائیں اور اسی طرح کی نمائشی سرگرمیاں کرا دیتے ہیں ۔ خالد بیگ صاحب نے اپنے مضمون "مروجہ نظام تعلیم اور مسلم تناظر" (شائع شدہ عالمی ترجمان القران لاہور مئی 2013ء) میں ملغوبہ تعلیم اور ملغوبہ سکولوں کا بہت اچھا محاکمہ کیا ہے جس کی روشنی میں نام نہاد اسلامی سکولوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں تک اسلامی ہی؟ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے اپنے مضمون میں جن باتوں کا رونا رویا ہے اور جو تجاویز دی ہیں سب قابل غور ہیں۔ دولت اکٹھی کرنے کی حرص اور نمائشی اسلامی کام کرنے کا شوق اس قدر بڑھ چکا ہے کہ حقیقت خرافاتِ جدیدہ میں کھوگئی ہے اور بنیادوں کی طرف واپسی (Back to Basics) کی سوچ بھی ہم اسلامسٹوں کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب کے مضمون پر اچٹتی نگاہ ڈالنے کے بعد ہم محترم محمد وقاص خان کے تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ آپ آغاز ہی میں فرماتے ہیں کہ:

"یہ تحریر بڑے درد سے لکھی گئی ہے لیکن اس درد کی شدت نے اسے راہِ اعتدال سے ہٹا کر مائل بہ افراط کر دیا ہے۔ پہلا تاثر یہ ہے کہ اسلامی سکولوں کے عنوان سے تحریر لکھ کر ملک میں چلنے والے اقلیتی اشرافیہ کے سیکولر الحاد پسند اور اباحیت فروغ اداروں کا سار نزلہ بیچارے اسلامی سکولوں پر نکالا گیا ہے۔ گویا فاضل مصنف ملک بھر میں جاری اسلامی طرز کے سکولوں میں جاری سرگرمیوں سے یا تو باخبر نہیں یا مغربی تہذیب ہی سے سرے سے نابلد ہیں"

محترم محمد وقاص خان نے درج بالا تبصرہ بڑے اخلاص کے ساتھ کیا ہوگا لیکن ہم سب کا مسئلہ یہی ہے کہ ہم ملغوبہ تعلیم اور ملغوبہ سکولوں کو ہی کافی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اسلامی کے سابقہ کے ساتھ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اُسے اسلامی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے ان نام نہاد اسلامی سکولوں میں اسلامی ٹیبلو، اسلامی فیشن شو اور اسلامی فن فیئر کے کئی مناظر دیکھے ہیں اور سر پیٹ کر رہ گیا ہوں کہ ہم اسلام کے مقدس نام پر اپنی تعلیمی تاجرانہ ذہنیت کی کس طرح پردہ پوشی کرتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار کا ڈاکٹر محمد امین کے متعلق یہ کہنا کہ " فاضل مصنف ملک بھر میں جاری اسلامی طرز کے سکولوں میں جاری سرگرمیوں سے یا تو باخبر نہیں یا

مغربی تہذیب ہی سے سرے سے نابلد ہیں" ایک حیران کن اور دلچسپ تبصرہ ہے جس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔ موصوف نے تعلیم کے عناصر ترکیبی کی اسلامی تناظر میں تشکیل جدید کی بھرپور تائید کی ہے اور ساتھ تنظیم اساتذہ پاکستان اور آفاق کا ذکرِ خیر بھی کیا ہے۔ راقم الحروف تنظیم اساتذہ پاکستان کے اولین ارکان میں سے عاجز رکن ہوتے ہوئے اور تنظیم اساتذہ کے شعبہ امورِ تعلیم اور تعلیمی پالیسی کا ایک طویل عرصے تک ناظم ہوتے ہوئے یہ اقرار کرتا ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا بھی لیکن ایسا بہت کچھ باقی ہے جو کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ مرحوم کی مہیا کردہ سہولتوں کے ساتھ راقم الحروف کی قیادت میں اسلامی منصوبہ نصاب پر کام کرتے ہوئے تنظیم اساتذہ کی ایک مضبوط اور بڑی ٹیم نے نرسری سے بارہویں جماعت تک ایک مربوط نصاب تیار کیا۔ اس منصوبہ میں ڈاکٹر محمد امین صاحب بطور انتظامی ڈائریکٹر کے مسلسل منسلک رہے۔ نصاب تو تیار ہوا لیکن کہیں نافذ نہ ہو سکا۔ بعدازاں تنظیم اساتذہ کی سکول چین حرا سکولز کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے میں نے ایک اجتماعی نصابی اور نصابی کتب کے ادارے کی تحریک کی جو بارآور ثابت ہوئی اور میری قیادت میں آفاق کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے میں ہم نے مذکورہ بالا نصاب کی روشنی میں نصابی کتب کا کام شروع کیا۔ اسلامی نظریے سے سرشار اساتذہ کی ایک مختصر ترین ٹیم نے مختصر ترین عرصے میں اسلامی روح کی حامل سب مضامین کی کتب تیار کردیں اور وہ شائع ہو کر سکولوں میں نافذ ہوئیں۔ پانچ سال تک راقم الحروف اس ادارے کا سربراہ رہا۔ بعدازاں آفاق نے طبعی ترقی تو کی لیکن اسلامی نظریہ کہیں گم ہی ہو کر رہ گیا۔ محترم محمد وقاص خان صاحب آفاق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان میں ایک ادارہ آفاق کا بھی ہے لیکن یہ کام ابھی ابتدا ہے اور بکھرا ہوا ہے جسے مجتمع کرنے اور موثر بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن آفاق کی موجودہ صورتِ حال تمام تر توسیع اور ترقی کے باوجود اسلامی نظریے کے حوالے سے اب ابتدا نہیں انتہا ہے اور اس انتہا میں اب اسلامی نظریہ کے فروغ کے لیے کوئی گنجائش شاید نظر نہیں آتی۔ تنظیم اساتذہ اور آفاق کے حوالے ناپسندیدہ تبصرہ ذرا کھل کر اس لیے کیا ہے کہ ہمیں اپنی کوتاہیوں کا بھی اعتراف کرنا چاہیے اور خوش فہمیوں سے باہر نکل کر معروضی صورتِ حال پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔

محترم محمد وقاص خان مغربی نظامِ تعلیم کے کلی انکار کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ " جہاں تک دوسرے اصول یعنی مغربی نظریے کے کلی انکار کا تعلق ہے اس کے لیے کسی مضبوط شرعی دلیل کا سہارا لینے کی بجائے محض مغرب کی شدید نفرت میں نفی داثبات کا مسئلہ چھیڑا گیا ہے حالانکہ عقائد کی دنیا کے اس مسئلہ کا یہاں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا اور نہ ہی کسی معاصر تہذیب کا کلی انکار سنت سے ثابت ہے"۔

مغربی استعماری تہذیب نے ہمارے ذہنوں کو اس طرح جکڑ لیا ہے اور شریعت کو اپنے ذاتی برانڈ

کی صورت میں ہم جا بجا اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ صاحبِ شریعت وسنت ﷺ بھی حیران ہوتے ہوں گے کہ میرے محب اور میری امت کے گلہائے سر سبد کیسے کیسے حسین خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے اس محترم بھائی سے کوئی یہ پوچھے کہ اب مغربی الحادی تہذیب کے رَد کے لیے بھی ہمیں مفتیانِ کرام سے شرعی فتویٰ لینا پڑیگا؟ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد کا مجلہ مغرب اور اسلام شمارہ ۴۰ جو اعلیٰ تعلیم، تہذیبی بالا دستی اور مغرب کے موضوع پر ہے، کا مطالعہ ہمارے اسلامی بھائیوں کے لیے بہت مفید ہوگا اور اسے پڑھنے کے بعد ان شاءاللہ محترم محمد وقاص خان صاحب جیسے ہمارے اسلامی عزیز اس محترم کو مغرب کی تہذیب کے کلی انکار کے لیے کسی شرعی دلیل کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ محترم محمد وقاص خان، ڈاکٹر محمد امین کی تجاویز

۱۔ تعلیم کو تجارت نہ سمجھا جائے۔　۲۔ انگریزی میڈیم سے باز آیا جائے۔

۳۔ مخلوط تعلیم سے نجات حاصل کی جائے۔　۴۔ غیر ملکی نصاب ترک کیا جائے۔

۵۔ موجودہ ہم نصابی سرگرمیوں اور یونیفارم کا بائیکاٹ کیا جائے۔

پر غور کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "اس نسخہء کیمیا پر عمل کیا جائے (سوائے مخلوط تعلیم کے جسے معاشرے نے من جملہ مسترد کر دیا ہے) تو اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ یہ ادارے خود بخود بند ہو جائیں گے بصورت دیگر اِن اداروں کے سربراہوں کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ ادارے بند کر دیے جائیں۔

محترم وقاص صاحب نے جو نتیجہ نکالا ہے کہ ادارے بند ہو جائیں یا بند کر دیے جائیں تو یہ اقدام یا نتیجہ بالکل درست ہوگا بہ نسبت اس کے کہ وہ سب کچھ کرتے ہوئے جو موصوف کے بقول اقلیتی اشرافیہ کے سیکولر، الحاد پسند اور اباحیت فروغ ادارے کر رہے ہیں ان اداروں پر اسلامی کا لیبل لگا کر معصوم اسلامی ذہنوں کو دھوکا دیا جائے اور ملغوبہ ماڈل کے ذریعے قوم کو بھی ملغوبہ قسم کی نئی نسل عطا کی جائے۔ مخلوط کے استرداد پر معاشرے کا اجماع تو راقم الحروف اپنے اسلامی بھائیوں کے مری، لاہور، کوٹلی، کراچی، پشاور، سوات میں مخلوط تعلیم کے گند میں لتھڑے کئی ادارے دیکھے ہیں جن کو دیکھ کر دیکھنے والے کا سر تو شرم سے جھک جاتا ہے لیکن ان نام نہاد اسلامی سکولوں کے سربراہوں کے دل ودماغ پر رتی برابر بھی جرم کا احساس نہیں ہوتا۔ توجہ دلائیں تو الٹا آنکھیں دکھاتے ہیں کہ آپ کو کیا پتہ کہ ہم ان اسلامی سکولوں کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر چلا رہے ہیں۔

محترم محمد وقاص خان صاحب نے تعلیم کو تجارت نہ سمجھا جائے پر عجیب وغریب دلائل دیتے ہوئے البرہان کو بھی "مفت" کی اصطلاح کے ساتھ آڑے ہاتھوں لیا ہے بہر حال گزشتہ صفحات میں ہم نے تعلیم

دینے کے عوض فیسوں کے معاملے پر جوگزارشات کی ہیں اُن کے بعد اس موضوع پر کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

آگے چلتے ہوئے محترم محمد وقاص خان اپنی ذاتی رائے کی روشنی میں اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اصل مسئلہ ایک صحیح العقیدہ مسلم استاد کی تیاری ہے اور دوسری ضرورت تدریجاً نصاب کو اسلامیانے کی طرف پیش قدمی ہے۔

موصوف نصاب کی ضرورت ثانوی اور استاد کی ضرورت اولین قرار دیتے ہیں یہ درست ہے کہ استاد کا درست ہونا بہت اہم ہے لیکن نصاب کا درست ہونا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ہم نے شروع میں اسلامی نظامِ تعلیم کے حوالے سے جو بحث کی ہے اور خصوصاً رسول اللہ ﷺ بطورِ معلم اور قرآن حکیم بطورِ نصاب تعلیم کے حوالے سے جو گزارشات پیش کی ہیں وہ اس سلسلہ میں مزید کسی بحث کی گنجائش نہیں چھوڑتیں۔

نصاب، کتاب اور استاد کے حوالے سے اسلامی تناظر میں مساعی بہت ہوئی ہیں اور اب بھی کہیں نہ کہیں جاری ہیں۔ اس سلسلہ میں اولین کوششیں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی ہیں جنہوں نے نمونے کے طور پر فزکس کی درسی کتاب کو اسلامیانے کی کوشش کی اور اسلامی نظامِ تعلیم کے خدوخال بھی بیان کیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تعلیمات بھی اس سلسلہ میں کافی قابل غور مواد لیے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری اور بعض نثری تحریریں بھی اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر بھارت نے بھی اپنے مضامین تعلیم میں مسلمان بچے کی تربیت اور اسلامی سیرت پیدا کرنے کے لیے مفید لائحہ عمل دیا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر ڈاکٹر سید محمد نقیب العطاس، ڈاکٹر سید محمد العطاس، ان کے فرزند ڈاکٹر فرید العطاس اور عرب دنیا کے ڈاکٹر سعید رمضان، ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی، ایران کے ڈاکٹر سید محمد نصر اور ڈاکٹر علی شریعتی، علی گڑھ کے دو مراکز ایک برائے اسلامی تعلیم اور دوسرا برائے اسلامی سائنس نے اس سلسلہ میں بڑا کام کیا ہے۔ پالیسی سٹڈیز اسلام آباد کے انسٹی ٹیوٹ نے بھی کچھ تعلیمی خدمات سر انجام دی ہیں۔ اسلامی منصوبہ نصاب کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور آفاق کے اولین پانچ سالوں میں نظریاتی سطح پر قابل قدر کام ہوا۔ لیکن یہ سب مساعی اس طرح بار آور نہیں ہوسکیں جس طرح کہ توقع تھی۔ کہیں تو اپنوں کی کلہاڑیوں اور تلواروں نے کام تمام کیا اور کہیں مغربی امریکی اور یہودی لابی کی سازشیں آڑے آئیں اور کہیں بلکہ شاید اکثر ہماری اپنی کمزوریاں غلط ترجیحات اور مفاداتی گروہی خرابیاں سدِ راہ بنیں اور اب تک نصاب، کتاب، معلم اور تعلیمی اداروں کو اسلامیانے کا کام تشنہ تکمیل ہے۔ دراصل اسلامی دنیا ایک طویل عرصے تک مغربی استعماری قوتوں کے زیرنگیں رہی اور ان استعماری قوتوں نے

قلب واذہان کو بدلنے پر بڑا دور رس کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری استعماری غلبے کے خاتمے کے باوجود اُن کا تعلیمی اور ذہنی استعماری غلبہ نہ صرف جاری رہا بلکہ ہم نے خود بڑھ کر اُسے گلے لگایا، اُسے گلے کا ہار بنایا، اُسے وہاں تک نفوذ کا راستہ دیا جہاں خود استعماری قوتیں پہنچنے سے قاصر ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تحریک اسلامی کا ایک مخلص سپوت (جو جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا فاضل رکن بھی ہے اور اس ادارے کے رکن کی ایک مسلم نظریاتی حیثیت ہے) بھی مغربی تہذیب کے کلی انکار کے لیے سنت کی نظیر اور شریعت کا جواز مانگتا ہے۔

ہمارے تعلیمی مسائل کے حوالے سے ام المسائل یہ ہے کہ ہماری جامعات مغربی استعماری تعلیمی اور تحقیقی روایات کو ہی (Perpetuate) کر رہی ہیں اور ان جامعات سے تیار ہو کر آنے والے فاضلین ہی زندگی کے دوسروں شعبوں کے علاوہ تعلیمی شعبے کی قیادت وسیادت کر رہے ہیں نتیجتاً پورا نظام تعلیم سکول سے لے کر یونیورسٹی تک ایک مغربی استعماری تہذیب وتمدن کی خودکار مشین (Perpetual Machine) بن گیا ہے جس کا توڑ کرنے کے لیے ایک بہت طاقت ور انقلابی تعلیمی تحریک کی ضرورت ہے۔ اس تحریک کو کون برپا کرے گا یہ ابھی بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

اس وقت ہمارا نظام تعلیم دوسروں پر انحصار کرنے والا نظام تعلیم ہے یہ آزاد اور خودمختار نظامِ تعلیم نہیں ہے۔ خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا پورا نظام مغرب کے نظامِ تعلیم پر انحصار کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید فرید العطاس نے ہماری اعلیٰ تعلیم کی انحصاریت کے سات پہلو بیان کیے ہیں جن کی وجہ سے ہم مغربی استعماری نظامِ تعلیم کے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ سات پہلو درج ذیل ہیں:

۱۔ خیالات پر انحصار ۲۔ خیالات کے ذریعے پر انحصار ۳۔ تعلیم کی ٹیکنالوجی پر انحصار

۴۔ تحقیق وتدریس کے لیے امداد پر انحصار ۵۔ تعلیم میں سرمایہ کاری پر انحصار

۶۔ ترقی پذیر معاشروں میں محققین کی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر معلومات کے مراکز میں طلب پر انحصار ۷۔ تعلیم، تحقیقی منصوبوں اور اس کے نتائج کی مغربی استعماری نظام کی طرف سے قدرشناسی پر انحصار

یہ ہفت پہلو انحصار اتنا وسیع اور اتنا گہرا ہے کہ ہمیں اونچا سانس لینے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ایک طاقت ور، مضبوط اور ہم گیر تعلیمی تحریک کی ضرورت ہے جس کی پشت پناہی حکومت کے ساتھ، نظریاتی گروہ اور اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیم یا تنظیمیں پوری یک سوئی اور مکمل یک جہتی کے ساتھ کریں تب ایک لمبے عرصے کے بعد ہم تعلیمی خود انحصاری اور تعلیمی خودمختاری تک پہنچ سکیں گے۔ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟ اور کیا محترم محمد وقاص خان جیسے اولعزم نوجوان اس علم کو اپنے مضبوط ہاتھوں

میں تھامنے کے لیے تیار ہیں؟

ملک احمد سرور

جہاد وقتال معطل کرنے کا نظریہ؟

محترم ومکرم ڈاکٹر محمد امین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ نے البرہان کے شمارہ مئی میں محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کا مضمون ''سیاسی جدوجہد نہ مسلح جدوجہد..... غلبۂ اسلام بذریعہ دعوت وصبر'' شائع کیا ہے۔ اس سے قبل یہ قومی ڈائجسٹ میں بھی شائع ہو چکا جس کی مجھے فوٹو کاپی موصول ہوئی تھی۔ میں نے اس کا جواب ماہنامہ چشمِ بیدار کے شمارہ مئی میں شائع کیا تھا۔ البرہان میں اس مضمون کی اشاعت پر میں اس لیے سخت حیران ہوا ہوں کہ آپ کو میں ایک صاحب مطالعہ ہی نہیں بلکہ صاحب بصیرت سکالر بھی سمجھتا ہوں۔ اس مضمون میں مرزا غلام احمد قادیانی کا نظریۂ جہاد پیش کیا گیا ہے۔ میرے دل میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کا احترام بدرجۂ اتم موجود ہے مگر معاملہ ''اسلام'' کا ہو تو محض ''احترام'' کی خاطر سنگین غلط تعبیر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کے استاد ہونے کے باوجود محترم پروفیسر صاحب نے اقبال کے شعر ہی کو غلط رنگ میں پیش نہیں کیا، سورہ الفرقان کی آیت 52 کے ترجمے کا بھی حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اقبال کے پورے کلیات کو پڑھ لیں، کہیں یہ سبق نہیں ملتا جو محترم پروفیسر صاحب نے پڑھانے کی کوشش کی ہے، اقبالؒ تو جہاد کا مبلغ تھا، اُس جتنا بڑا مبلغ تو ملا عمر بھی نہیں۔ اگر میرے دعوے پر کسی کو شک ہے تو اقبالؒ کے کلیات پڑھ لے۔ (اس موضوع پر پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم کا ایک جامع مضمون بھی ہے، ملا تو آپ کو ارسال کر دوں گا) بیدار والا مضمون آپ کو بھیج رہا ہوں، مناسب سمجھیں تو جواب کے طور پر شائع کر دیں، شکریہ (ملک احمد سرور)

1970ء کی دہائی میں نظریاتی جنگ عروج پر تھی۔ تمام تر سختیوں اور قید و بند کے باوجود اس محاذ پر اہل ایمان نے بے مثال ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ شہید ضیاء الحقؒ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اسلام پسند اہل قلم کو خوب نوازا۔ اس کے نتیجے میں یہ گروہ سہل اور تعیش پسندی کا شکار ہو گیا، اور اس کے لیے حکمرانوں سے دور رہنا مشکل بن گیا۔ 9/11 ڈرامے کے بعد تو تعیش کے عادی یہ اسلام پسند ڈھیر

ہو گئے۔ نہ صرف ڈھیر ہو گئے بلکہ طاغوت سے برسرپیکار مجاہدین کے حامیوں کو بھی ڈھیر ہونے کے مشورے اور ترغیبیں دینے لگے۔ ان کی تحریک کے نتیجے میں کئی راسخ العقیدہ معروف اسلام پسند بھی طاغوت کی مزاحمت سے پیچھے ہٹ گئے۔

قومی ڈائجسٹ کے شمارہ فروری میں محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا۔ سچ بات ہے کہ یہ مضمون پڑھ کر ذہن ہل گیا۔ ارادہ کیا کہ جامع انداز سے اس کا جائزہ لوں مگر وقت بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے، لہٰذا فی الحال مختصراً ہی عرض کروں گا۔ ''عالمی صلیبی جنگ کا مقابلہ کیسے ہو؟'' کا جائزہ پیش کرتے ہوئے محترم پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> ''چونکہ ہم ہر اعتبار سے بہت کمزور ہیں، اور ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم واقعی بہت کمزور ہیں اور دشمن ہر لحاظ سے بہت طاقتور ہے اور وہ کسی بھی صورت حال میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کسی مسلمان ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو، اس لیے ہمیں بامر مجبوری یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹ جانا چاہیے اور اسلامی نظام کی تحریکوں کو وقتی طور پر معطل کر دینا چاہیے...... فی زمانہ اس کے سوا چارہ کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ صورت حال کے حوالے سے ہم حالت مکی میں رہ رہے ہیں...... اب ہمیں جہاد و قتال کے ارادے ملتوی کر کے ساری توجہ جہاد بالقرآن پر مبذول کر دینی چاہیے کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے جہاد کبیر قرار دیا ہے۔ ترجمہ: ''گویا جب حالات سازگار نہ ہوں تو کفار کی اطاعت تو نہ کرو لیکن اس وقت قتال کی بجائے جہاد بالقرآن کا اسلوب اختیار کر لو۔'' (الفرقان:52)...... اسی لیے بے حد ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے خلاف دشمنی اور محاذ آرائی کا سلسلہ یک طرفہ طور پر ختم کر دیں اور بڑے سے بڑا نقصان اٹھا کر اس کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اختیار کریں اور یہ تسلیم کر لیں کہ ہندوستان جغرافیے اور آبادی کے اعتبار ہی سے نہیں ہر حوالے سے ہم پر برتری رکھتا ہے۔ پھر جب دونوں ملکوں کے تعلقات نارمل ہوں گے اور دشمنی پس منظر میں چلی جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ چند سالوں میں انقلابی تبدیلی رونما ہو گی اور اب آٹھ لاکھ ہندو عیسائی ہو رہے ہیں تو پھر اس کے مقابلے میں سالانہ بیس لاکھ ہندو مسلمان ہونے لگیں گے۔'' یہ بھی حوالہ دیا گیا ہے کہ مکہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کے ظلم وستم کا مقابلہ کرنے کی اجازت مانگی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صبر کرو، ہم

تعداد میں تھوڑے ہیں۔''

اس تحریر میں پانچ باتیں جواب طلب ہیں: (1) وقتی طور پر اسلامی نظام کی تحریکوں کو معطل کر دینا چاہیے۔ (2) ہم حالت مکی میں ہیں۔ (3) جہاد بالقرآن پر توجہ مبذول کر دینی چاہیے۔ (4) ہندوستان ہر حوالے سے ہم سے برتر ہے۔ (5) مسلمان تھوڑی تعداد میں ہوں تو مزاحمت نہیں کی جاتی۔

معلوم نہیں کہ ایک ارب 65 کروڑ افرادی قوت رکھنے والی ملت پر ''حالت مکی'' کا اطلاق کیسے ہوتا ہے۔ 57 آزاد مسلم ممالک ہیں جن کی مجموعی فوج پچاس لاکھ سے زائد ہی ہوگی۔ وسیع وعریض رقبہ ہے۔ ''حالت مکی'' میں ہجرت حبشہ بھی تھی، بتایا جائے کہ اب اگر 57 ممالک کے اہل ایمان ہجرت کریں تو کس علاقے میں کریں۔ پھر ان 57 ممالک میں ابولہب اور ابوجہل کون ہیں، کیا نواز شریف، طیب اردگان، حسن روحانی، شاہ عبداللہ سب ابولہب اور ابوجہل ہیں؟ کیا ''حالت مکی'' میں مسلمان دنیا کا 25 فیصد تھے؟ مدینہ میں جب مسلمانوں کی ریاست وجود میں آئی تو وہاں بھی مسلمان اقلیت میں تھے۔ مزید برآں مسلمان ''مکی حالت'' سے اس لیے نکلنے میں کامیاب رہے کہ انہوں نے اپنی تحریک کو معطل نہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک کہا کہ ''میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے، میں تبلیغ حق کے فرض سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' مشرکین مکہ نے یہی مطالبہ کیا تھا کہ ان کے معبودوں کی مذمت بند کی جائے۔ پھر حالت مکی میں شعب ابی طالب بھی ہے، مسلم ممالک میں تو ہمیں ایسی کوئی صورت حال دور دور تک نظر نہیں آتی، غزہ کا محاصرہ ہے لیکن اللہ وہاں بھی امداد پہنچا رہا ہے۔ طاغوت جتنا مرضی طاقتور ہے لیکن اس کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ وہ پانچ چھ بڑے مسلم ممالک کا ہی محاصرہ کر سکے۔ حالت مکی میں تو مسلمانوں کی مالی حالت بھی بہت پتلی تھی اور کسی مسلمان نے ابولہب اور ابوجہل کی تجوریوں میں کوئی رقوم جمع نہیں کروا رکھی تھیں، اب تو طاغوت کی تجوریوں (بینکوں) میں مسلمانوں کے کھربوں ڈالر جمع ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی ''حالت مکی'' کے ساتھ ایک بھی مماثلت نہیں ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد حالت مدنی کے ساتھ جو ایک مماثلت ہے، اس میں بھی ہمارے مسلم حکمران اور شیوخ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرتے۔ صلح حدیبیہ کی ایک ناروا شرط کے باعث مکہ سے بھاگ کر مسلمان مدینہ میں پناہ نہیں لے سکتے تھے۔ ان مسلمانوں نے مقام عیص کو اپنا مرکز بنا کر مشرکین مکہ کے تجارتی قافلوں پر حملے شروع کر دیے، بقول طبری ''قافلوں کو روکتے، قتل کرتے اور غارت گری کرتے۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو انہیں روکا اور نہ ان کی مذمت کی، نہ ان پر چوری، ڈاکے اور قصاص و دیت کا کوئی مقدمہ چلا۔

''جہاد بالقرآن'' کے لیے انہوں نے سورہ الفرقان کی آیت 52 کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا مودودیؒ

نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: ''پس اے نبی! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔'' پیر کرم شاہ الازہریؒ کا ترجمہ ہے: ''پس کافروں کی پیروی نہ کرو اور خوب ڈٹ کر مقابلہ کرو ان کا قرآن سے۔'' پروفیسر مذکور مولانا مودودیؒ کی فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے مولانا مودودیؒ ہی کی تفسیر سے عرض ہے کہ وہ لکھتے ہیں:

''جہادِ کبیر کے تین معنی ہیں: ایک، انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جدوجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لاکر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے، جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں اس پر اپنی طاقت بھی لگا دے اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو، کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے اور جان و مال کا بھی اور توپ و تفنگ کا بھی۔'' (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 457، حاشیہ 67)

مولانا مودودیؒ کا یہ اقتباس ہی پروفیسر صاحب کی ہر دلیل رد کر دیتا ہے۔

''ہندوستان کا ہر حوالے سے برتر ہونا'' یہ فقرہ ایک مسلم سکالر کے شایانِ شان ہی نہیں۔ رقبے اور آبادی کے علاوہ کوئی تیسری برتری نہیں۔ اسلام کا نظریہ اور نظامِ حیات ہر لحاظ سے برتر ہے اور قوموں میں پہلا موازنہ ''نظریے'' ہی کا ہوتا ہے۔ زندگی کے چند شعبوں میں وہ جو آگے نکلا ہے، وہ نظریے کی وجہ سے نہیں بلکہ بھٹو اور اس کے جانشینوں کی وجہ سے نکلا ہے۔ ایوب خان کے دور تک تو پاکستان بہت آگے تھا۔ پاکستان کے حکمران طاغوت کی بندگی نہ کرتے تو پاکستان آج بہت آگے نکل چکا ہوتا۔ قوم کے ذہنوں میں بھارت کی ''برتری'' بٹھانا قوم کو شودر بننے کے راستے پر ڈالنا ہے۔ شودروں کو بھی یہی سبق پڑھایا گیا تھا کہ حملہ آور بہت طاقتور اور برتر ہیں، اس لیے مزاحمت ختم کر دو۔ مزاحمت کم ہوئی تو مادرِ وطن ہندوستان کے اصل مالک ہونے کے باوجود وہ چوتھے درجے کے شہری ''شودر'' بنا دیے گئے۔ اگر وہ مزاحمت جاری رکھتے تو آج برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔

''مسلمان تھوڑی تعداد میں ہوں تو مزاحمت نہیں کی جاتی''، جو بھی قوم بڑی قوم بنی ہے، ابتدا میں وہ تھوڑی ہی تھی۔ جنگ بدر میں کتنی تعداد تھی؟ جنگ موتہ کے موقع پر مسلمانوں اور کفار کا کیا تناسب تھا؟ سورہ البقرہ آیت 249 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا، اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔'' ایک مومن تو قرآن کے الٹ نہیں

چل سکتا۔ اگر پروفیسر صاحب کی ان نصیحتوں کو پیش نظر رکھا جاتا تو اسلام کبھی غالب نہ آتا، آج پاکستان بھی موجود نہ ہوتا، سوویت یونین کے خلاف مزاحمت نہ ہوتی تو وہ روس تک نہ سکڑتا، امریکہ اور 48 اتحادی لشکروں کے خلاف طالبان خاموش رہتے تو آج امریکہ شکست کھا کر بھاگنے کا راستہ نہ مانگ رہا ہوتا۔ اگر بڑے لشکروں اور اعلیٰ اسلحے والے ہی ہمیشہ فتح یاب رہتے تو پھر ایک ہی گروہ مستقلاً برسراقتدار رہتا۔ مسلم امہ کا مسئلہ تعداد کا ہے نہ اسلحے کا بلکہ اہل قیادت کا مسئلہ ہے۔ اسلامی تحریکوں کو معطل کرنے کا مشورہ تاریخ سے ناآشنائی ہے۔ اس وقت بھی عسکری میدان میں مجاہدین کا پلڑا بھاری ہے مگر نظریاتی محاذ ڈھیر ہو چکا ہے جو اکا دکا آوازیں ہیں، پروفیسر صاحب انہیں بھی خاموش دیکھنا چاہتے ہیں مگر ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ اہل ایمان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب بھی وہ مکمل طور پر بے بس ہوئے، قدرت میدان عمل میں خود کود پڑی، پھر دنیا نے طوفانِ نوح دیکھا، عاد وثمود اور قوم لوط کی تباہی دیکھی، مگر تاریخ میں اہل ایمان نے کبھی اپنی تحریک کو معطل نہیں کیا۔ جہاں تک راقم کا مطالعہ ہے ''جہاد معطل کرنے کا نظریہ'' قادیانی ڈاکٹرائن ہے، جسے بعد میں برصغیر کے ایک اور فرقے نے بھی اپنا لیا۔ امت کے صحیح العقیدہ اکابرین نے کبھی اس نظریے سے اتفاق نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد امین

کیا امت کسی دینی منہج پر متفق ہو سکتی ہے؟

البرہان کے شمارہ مئی میں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کا موقف شائع ہوا تھا کہ اس وقت امت مسلمہ کے جو حالات ہیں۔ ان میں بہترین لائحہ عمل دعوت وصبر کا ہے نہ کہ سیاسی مزاحمت و جہاد کا اور انہوں نے اسے مکی دور قرار دیا۔ تازہ شمارے میں ماہنامہ چشم بیدار، اور ماہنامہ خطیب کے مدیر اور ماہنامہ آفاق کینیڈا کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جناب ملک احمد سرور صاحب نے اس پر تنقید کرتے ہوئے اسے ابطال جہاد کا قادیانی موقف قرار دیا ہے اور موجودہ حالات کے کلی دور پر قیاس کو بھی دلائل سے ردّ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کئی عوامل دینی تصورات کے صحیح فہم میں مانع ہیں جیسے:

۱۔ ہم لوگوں نے اپنی زبان میں جو اصطلاحات وضع کی ہیں جیسے غلبۂ دین، نفاذِ شریعت، نظام مصطفی وغیرہ انہوں نے بھی دینی تصورات کے صحیح فہم میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ اسی طرح بعض منصوص دینی تصورات کے بھی ناقص مفاہیم لوگوں میں شائع اور مروج ہو چکے ہیں جیسے دین کو مذہب اور ریلیجن کے معنی میں لینا اور عبادت کو مراسم عبودیت تک اور جہاد کو قتال تک محدود سمجھنا۔ اور بعض جدید دینی تحریکوں کے قائدین نے اقامت دین کو ریاست اقتدار کے صالحین کے ہاتھوں میں دینے اور اقتدار کو دینی مقاصد کے لیے استعمال کرنے تک محدود کر دیا ہے۔

۲۔ اسی طرح موجودہ حالات میں سیرت طیبہ سے استشہاد اور رہنمائی لینے کے معاملے میں کئی اہل علم ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور ان کی نظروں سے یہ ابت اوجھل ہو جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخصوص حالات میں کام کیا اور آج کے ہر معاملے کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کار نبوت کا آغاز دعویٰ نبوت سے کیا جب کہ ہم میں سے کوئی آج یہ حرکت نہیں کر سکتا۔ مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخاطب کفار اور غیر مسلم تھے۔ مدینہ میں آپؐ کے مخاطب اہل کتاب بھی تھے اور مسلمان معاشرے و ریاست کی تشکیل وتہذیب بھی آپ کے پیش نظر تھی۔ آج اگر ہمیں ایک مسلم معاشرے اور ریاست میں دینی کام کرنا ہو تو اسے کلی یا مدنی دور پر کرنا قیاس ہے مع الفارق ہوگا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود و

نصاریٰ پر غلبہ پانے کے بعد ان سے جو سلوک کیا اس کا انطباق آج کے حالات پر نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ مسلمان مغلوب ہیں اور یہودی و نصاریٰ اور ان کی تہذیب غالب و بالا دست ہے۔ آپ ﷺ کے مخاطب کفار تھے اور آپ ﷺ نے حسب حکم الٰہی کو **تعلیمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم**۔ صرف دعوت و تربیت کے ذریعے پہلے افراد کو ہدف بنایا اور پھر اسی کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جب کہ آج مسلم معاشرہ اور ریاست پہلے سے موجود ہے اور مقصود صرف ان کی اصلاح اور انہیں آئیڈیل کے قریب تر لانا ہے۔ اگر کوئی اہل علم ان فروق کو ملحوظ رکھے بغیر منہاج نبوی کی پیروی کا دعویٰ کرے تو یہ قیاس مع الفارق ہو گا اور غالب امکان ہے کہ وہ غلط نتیجے پر پہنچے گا۔

۳۔ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم میں سے ہر مسلک اور گروہ اپنے آپ کو حق کا واحد علمبردار سمجھتا ہے، حق کو اپنے دائرے میں محصور سمجھتا ہے اور باقی سب کو غلط اور ضال و مضل سمجھتا ہے۔

مندرجہ بالا عوامل کو ساتھ رکھتے ہوئے اگر ہم آج کے مسلم معاشرے کا تجزیہ کر لیں تو یہ نظر آتا ہے کہ جو کام رسول کریم ﷺ نے انجام دیے انہوں نے مرور وقت کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل گروہوں / اداروں / تحریکوں / جماعتوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۱۔ دعوت و تبلیغ اور تعلیم (دینی مدارس و عصری تعلیم)

۲۔ اصلاح و تربیت اور تزکیہ نفس

۳۔ ریاست کی اصلاح کے لیے سیاسی جدوجہد تا کہ صالح قیادت برسر اقتدار آ سکے اور اقتدار کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

۴۔ کفار کے خلاف جہاد (ریاست کی عدم موجودگی میں) یا غیر معمولی حالات میں غیر صالح مسلم حکومت کے خلاف خروج و بغاوت۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت جتنے بھی دینی عناصر متحرک ہیں ان چاروں میں سے کسی ایک دائرے میں کام کر رہے ہیں کوئی دعوت و تبلیغ و تعلیم میں مصروف ہے، کوئی تزکیۂ نفس کے لیے کام کر رہا ہے، کوئی سیاسی جدوجہد میں مصروف ہے اور کوئی جہاد کر رہا ہے۔ یہ سارے دینی کام ہیں اور سارے منصوص و مسنون ہیں۔ یہ سب خیر کے کام ہیں اور جو کوئی جس شعبے میں بھی اخلاص سے مصروف عمل ہے وہ ان شاء اللہ عند اللہ ماجور ہو گا۔

خرابی یہ ہے کہ ہر گروہ یہ سمجھتا ہے کہ صرف میں صحیح ہوں، صرف مَیں صحیح راستے پر ہوں باقی سب غلط ہیں اور غلط راستے پر ہیں حالانکہ سارے ہی صحیح منہج پر ہیں صرف اتنی وسعت قلبی اور وسعت فکری کی ضرورت ہے کہ وہ دوسروں کے کام کو بھی دین کا کام سمجھیں اور دین کا کام سمجھ کر ان سے تعاون کریں۔ ہم تجویز کرتے ہیں کہ ہر مسلمان ملک میں بزرگ اور معتدل مزاج علماء (جو مذکورہ حقیقت کا ادراک رکھے ہیں) پر مشتمل ایک کونسل بنائی جائے جو دین کے ان مختلف دائروں میں کام کرنے والے گروہوں / جماعتوں کے درمیان رابطے کا کام کرے۔ انہیں وقتاً فوقتاً (مثلاً سالانہ بنیادوں پر) یا حسب ضرورت اکٹھا کرے اور ان کی اس موضوع پر تربیت کرے کہ دین پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کے ان سب دائروں میں کام کرنے والے لوگ درحقیقت دینی مقاصد ہی کے لیے کام کر رہے ہیں لہٰذا اسے برّ اور تقویٰ کا کام سمجھ کر وہ آپس میں تعاون کریں اور ان کے درمیان اخوت و محبت ہونی چاہیے۔ کام وہ بے شک اپنے اپنے دائرے میں کرتے رہیں۔

دعوت کا کام کرنے والوں کو سمجھنا چاہیے کہ سیاسی اصلاح کا کام بھی دین کا کام ہے کیونکہ مسلمان حکمران اگر نظام حکمرانی اسلام کے مطابق نہ چلائیں تو دین میں بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح جہاد بھی ضروری ہے کیونکہ اگر کفار کا مقابلہ نہ کیا جائے تو اسلام کی ہوا خیزی ہوگی اور مسلمانوں کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اسی طرح جہاد کرنے والوں کو سیاسی جدوجہد یا تزکیۂ نفس میں مشغول گروہوں یا دعوت و تبلیغ میں مشغول جماعتوں کے کام کو ہلکا اور بے سود نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ ہر فریق دین کے کسی نہ کسی شعبے کو سنبھالے ہوئے ہے۔ غرض یہ چاروں گروہ ایک دوسرے سے تعاون کریں، ہر گروہ دوسرے گروہ کے کام کو بھی عین تقاضائے دین سمجھے، ان میں قریبی رابطہ ہونا چاہیے اور انہیں مل کر ملکی سطح پر اپنے کاموں کے اثرات کا جائزہ لینا چاہیے اور باہم مشاورت سے اپنے کاموں کو موثر بنانے کے لیے سوچ بچار کرنی چاہیے۔

اسی طرح کی ایک کونسل امت مسلمہ کی سطح پر بھی ہونی چاہیے جس میں سارے مسلمان ممالک معتدل و ثقہ علماء شامل ہوں جو امت کی سطح پر ان کاموں کے درمیان رابطے کا سوچ، متعلقہ گروہوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے، انہیں مل بٹھائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں اور ان میں باہم مشاورت اور تعاون کو فروغ حاصل ہو۔

اس میں ایک چیز کا دھیان رکھنا البتہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کی تنظیموں میں دشمن کے ایجنٹ نہ گھس آئیں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو وہ خرابی کا سبب بنیں گے اور اتفاق و اتحاد کو انتشار و افتراق میں

بدل دیں گے۔

ہمارے نزدیک یہ واحد صورت ہے جس پر عمل کر کے ہم امت کے مختلف مسالک اور گروہوں کو قریب لا سکتے ہیں اور انہیں باور کرا سکتے ہیں کہ سب لوگ منصوص ومسنون اعمال میں مصروف ہیں۔ فروعات وتفصیلات میں جو اختلافات ہیں وہ اجتہادی نوعیت کے ہیں جن پر اتفاق ضروری نہیں۔

ہم اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری رائے میں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کو کہنا چاہیے کہ ان کے نزدیک وقت کی آواز یہ ہے کہ صبر سے دعوت وتربیت کا کام کیا جائے تاکہ جو لوگ دینی مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں یا کفار کے خلاف جہاد کر رہے ہیں وہ کوئی بھی غلط کام نہیں کر رہے بلکہ دین ہی کا کام کر رہے ہیں اور ملک احمد سرور صاحب کو کہنا چاہیے کہ ان کے نزدیک اس وقت بہترین منہج یہ ہے کہ کفر کے خلاف جہاد کیا جائے تاہم جو لوگ دعوت واصلاح کا کام کر رہے ہیں وہ بھی دین ہی کا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ وہ واحد راستہ ہے جسے اپنا کر امت متحد ہو سکتی ہے کہ یہ چاروں منہج ٹھیک ہیں۔ آپ جس منہج کو ضروری یا مفید تر سمجھتے ہیں اس پر خود عمل کریں لیکن دوسروں کی تردید یا تغلیط نہ کریں بلکہ ان کے کام کو بھی دینی کام سمجھیں۔ امت اتنی بڑی ہے، کروڑوں اور اربوں کی آبادی ہے۔ ہر آدمی کی اپنی ایک سوچ ہے۔ ایسے میں ان میں اختلاف رائے کا ہونا فطری ہے۔ اتنے لوگوں کو کسی ایک منہج پر اکٹھے کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ اور اختلاف رکھتے ہوئے قرآن وسنت پر مبنی چند ایک مناہج پر ان کو مجتمع کر لینا وقت کی آواز اور اتحاد کی واحد صورت ہے لہٰذا اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ ہماری اس تجویز پر غور فرمائیں۔

رمضان۔ تزکیۂ نفس کا مہینہ

اے لوگو! ایک عظیم اور بابرکت مہینہ تم پر سایہ فگن ہونے کو ہے، وہ مہینہ جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جس میں روزہ رکھنا فرض ہے اور جس کی راتوں میں تراویح پڑھنا افضل ہے۔ جو شخص اس مہینے میں برضا و رغبت نیکی کا کام کرے گا اس کا ثواب عام مہینوں میں فرض کی ادائی کے برابر ملے گا اور جو اس ماہ مقدس میں فرض ادا کرے گا اسے ستر فرضوں کے برابر ثواب عنایت ہوگا۔ رمضان کا مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ مہینہ معاشرے کے غریب اور حاجت مندوں کے ساتھ مالی ہمدردی کا مہینہ ہے۔ (مشکوٰۃ)

جس شخص نے ایمانی کیفیت کے ساتھ اور اجر آخرت کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور راتوں کو قیام کیا، اللہ اس کے ان گناہوں کو معاف کر دے گا جو پہلے سرزد ہو چکے ہیں (صحیح و مسلم)

روزہ اور قرآن مومن کے لیے سفارش کریں گے روزہ کہے گا: ’’اے میرے رب! میں نے اس شخص کو دن میں کھانے اور دوسری لذتوں سے روکا تو یہ رکا رہا، اس شخص کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔‘‘ قرآن کہے گا: ’’میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکا، اے میرے رب! اس شخص کے حق مین میری سفارش قبول کر۔‘‘ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی سفارش قبول فرمائے گا۔ (رواہ احمد)

رمضان المبارک کے مہینہ میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ بس محروم ہی رہ گیا۔ فرمایا: ’’شب قدر کو تلاش کرو، رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں۔‘‘ (صحیح بخاری)

رمضان المبارک میں نبی اکرم ﷺ کے معمولاتِ قرآن میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر رات کو رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرتے، جس میں حضور اکرم ﷺ قرآن سناتے۔ اس طرح پورے قرآن کا دور مکمل ہوجاتا تھا۔ ابوداؤد کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ کی تلاوت کا وقت نماز عشاء کے بعد ہوتا تھا۔ روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی۔ اس تعداد کے

موافق تلاوت کرلیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں عام دنوں کے مقابلے میں عبادت وذکر میں بے پناہ محنت ومشقت فرماتے تھے۔عشرہ آخر شروع ہوتا تو آپ ﷺ کمر کس لیتے، تمام رات بیدار رہتے، ازواج مطہراتؓ سے بے تعلق ہوجاتے، اہل خانہ کو بھی نماز کے لیے جگاتے، یادِالٰہی اور عبادت میں مشغول رہتے۔'' (صحیح بخاری ومسلم)

حضرت ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فریاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرائیل علیہ السلام قرآن سنانے آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی (صحیح بخاری)

احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزے کے دوران میں مسواک فرمایا کرتے تھے اور وضو کرتے وقت مسواک کا استعمال فرماتے تھے۔

مفتی عارف محمود

کریڈٹ کارڈ۔تعارف اور فقہی جائزہ

استاذ ورفیق شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ فاروقیہ کراچی

تاریخ انسانی، خاص طور سے اسلامی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ سولہویں صدی میں خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد وجود پانے والا مغربی نظام تمام شعبہ ہائے زندگی میں طرح طرح کی نئی تبدیلیوں کا باعث بنا، نئی ایجادات نے انسان کو جدید سے جدید تر کی دوڑ میں لگا دیا، جس کی وجہ سے نئے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظریات وجود میں آ گئے، مذہب کو نجی معاملہ قرار دے کر عملی طور سے اسے انسانی زندگی سے بے دخل کیا گیا، سرمایہ دارانہ سوچ وفکر کے حامل چند لوگوں نے نئے سیاسی نظام جمہوریت کی چھتری تلے تمام عالم کی اقتصادیات کو اپنے ذاتی مفادات کا تابع بنالیا؛ حتیٰ کہ یہ چند مٹھی بھر سرمایہ دار اپنی اقتصادی طاقت کے بل بوتے پر بڑے بڑے ملکوں کی سیاست وسیادت پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اس محدود سرمایہ دار طبقہ کی یہ مسلسل کوشش ہے کہ مادی ترقی اور جدید سے جدید ایجادات کا تسلسل قائم رہے، تاکہ انسانی معاشرہ ان کے دیے ہوئے نئے سیاسی اور معاشی نظام کے تحت ان کی اغوا کاری کا شکار رہے اور معاشیات واقتصادیات سمیت پورا معاشرتی نظام ان کے زیر اثر رہ سکے، چنانچہ جدید مادی تجربات اور تجزیوں نے انسانیت پر ایسا نشہ طاری کر دیا ہے کہ وہ ضرورت وحاجت اور کمال کے مابین فرق کرنا بھول گئے، بازار میں جو نئی چیز آ گئی اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور خریدتے جاتے ہیں، خواہ ان کی مالی واقتصادی حالت اور مالی بجٹ اس کی اجازت نہ دیتا ہو۔

سرمایہ دارانہ قوت نے نہ صرف انسانوں کی محنت اور فکر سے تیار کردہ موجودہ تمام اشیاء پر تسلط جمایا ہوا ہے، بلکہ آئندہ وجود میں آنے والی چیزوں کو بھی نگل جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اس سرمایہ دارانہ قوت وطاقت نے نہ صرف مزدور ومتوسط طبقے کو اپنا غلام بنالیا ہے بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی محنتوں پر بھی قابض نظر آتی ہے، اسی پر بس نہیں بلکہ مستقبل میں انسان کو غلام بنانے اور اس کی کمائی ہوئی دولت

اس کے ہاتھ میں آنے سے پہلے قبضہ کر لینے کی غرض سے عالمی سطح پر قرض کے لین دین کو انتہائی آسان اور عام بنا دیا گیا۔ سرمایہ دار نے اپنی دو دھاروں سے انسانی سرمایہ کو ذبح کر دیا ہے، ایک طرف تو اس نے سامان اور خدمات وغیرہ کو فروخت کر کے نفع کمایا، تو دوسری طرف تاخیر کی صورت میں سود بھی وصول کرنا شروع کر دیا، لہٰذا سرمایہ دار نے یہ کوشش کی کہ خرچ کو آسان سے آسان تر بنا دیا جائے، چنانچہ اس غرض سے اصل زر سونا، چاندی کی جگہ کاغذی نوٹ اور بینک کے چیک کو رواج دیا گیا۔ پھر مزید اس میں نت نئی شکلیں ایجاد کی گئیں، حیرت انگیز ترقی یافتہ الیکٹرونک ایجادات اور نہایت تیز رفتار مواصلات کے ذریعہ قرض اور لین دین سہل اور آسان بنانے کے لیے مختلف کارڈ مارکیٹ میں لائے گئے، جن میں اے ٹی ایم کارڈ، ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ زیادہ مروج ہیں؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ خرچ کو ممکن بنایا جاسکے۔ دوسری طرف تاخیر کی صورت میں مزید رقم وصول کرنے کا موقع فراہم ہو جائے، غرض اس سب کا مقصد محض انسانیت کی خدمت نہیں، بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ دنیا کا خرچ اس کی پیداوار سے بڑھ جائے اور وہ بالآخر اپنا سرمایہ اور وجود پوری طرح ان سرمایہ داروں کے پاس گروی رکھنے پر مجبور ہو جائے۔

کریڈٹ کارڈ کے وجود میں آنے کی وجہ اور اس کی ضروت کیوں پیش آئی؟ اس بات کو علماء اور معاشیات کے ماہرین نے مختلف انداز اور تعبیرات میں بیان کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ صحیح بخاری کی درسی تقریر ''انعام الباری،، میں ''کریڈٹ کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آئی'' کے عنوان سے فرماتے ہیں: ''پہلے یہ سمجھ لیں کہ کریڈٹ کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ چوری، ڈاکے بہت ہونے لگے ہیں، اگر کوئی آدمی گھر سے نکلے اور اسے لمبی چوڑی خریداری کرنی ہو، اب اگر وہ جیب میں بہت سارے پیسے ڈال کر لے جائے، تو خطرہ ہے کہ ڈاکہ پڑ جائے، کوئی چھین لے جائے، خاص طور پر اگر کہیں سفر پر جا رہا ہو تو ہر وقت اپنے پاس بڑی رقم لے کر پھرنے میں بہت خطرات ہیں، اس لیے اس کا ایک یہ طریقہ نکالا کہ بینک ایک کارڈ جاری کرتا ہے، جس کو کریڈٹ کارڈ کہتے ہیں''۔(۱)

بعض حضرات نے اسے نئے معاشی نظام کا نتیجہ قرار دیا ہے۔(۲) فقہ اکیڈمی ہند کی طرف سے جو سوالنامہ کریڈٹ کارڈ پر بحث کے حوالے سے مرتب کیا گیا تھا اس میں گلوبلائزیشن اور اس کے نتیجے میں معیشت وتجارت میں رونما ہونیوالے اثرات اور رقوم کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کی حاجت وضرورت کو کریڈٹ کارڈ کے وجود میں آنے کا سبب بتایا گیا ہے(۳)، یہی مذکورہ بالا وجہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے بھی کریڈٹ کارڈ کے حوالے سے اپنے مقالہ میں بھی تحریر کی ہے(۴)، ڈاکٹر وہبہ مصطفی زحیلی صاحب نے کریڈٹ کارڈ پر اپنے مقالہ ''بطاقات الائتمان'' میں اسے

سماجی اور معاشی انقلاب قرار دیا ہے۔(۵)

بہر حال کریڈٹ کارڈ کے وجود میں آنے کی جو وجہ بھی بیان کی جائے وہ اپنی جگہ ہے، لیکن اتنی بات تو سب میں قدرے مشترک اور مسلم ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں وجود پزیر ہوا ہے، کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو بے لگام گھوڑے کی طرح آزاد چھوڑا گیا، جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے نت نئے طریقے اختیار کئے گئے۔ سرمایہ دار کے استحصالی دماغ نے لوگوں کے سرمایہ کو سمیٹنے کے لیے بینکنگ کے نظام کو متعارف کروایا، اسی پر بس نہیں، بلکہ آئے روز نئے ہتھکنڈوں کے ذریعے عوام الناس کا خون نچوڑا جا رہا ہے، یہ کیسے ہو رہا ہے، اس بارے میں شیخ محمد مختار سلامی صاحب، مفتی اعظم تیونس نے تفصیلی گفتگو کی ہے، وہ کریڈٹ کو عصر حاضر کی حیرت انگیز ترقی یافتہ الیکٹرونک ایجادات اور تیز رفتار مواصلات کا شاخصانہ قرار دیتے ہیں۔(۶)

کریڈٹ کارڈ کی تاریخ اور پس منظر: "بيت التمويل الكويتي" کی طرف سے کریڈٹ کارڈ کی تاریخ کچھ یوں بیان کی گئی ہے: ''پیمنٹ کارڈ(Payment Card) جاری کرنے کی طرف پہلا قدم امریکی ریاستوں میں ویسٹرن یونین(Western Union) نامی کمپنی نے اٹھایا، اس کمپنی نے ۱۹۱۴م میں اپنے بعض خاص کسٹمرز کو واجبات کی ادائیگی (Payment) میں مہلت وسہولت فراہم کرنے کی غرض سے ایک کارڈ جاری کیا۔ ۱۹۱۷ء میں بعض بڑے ہوٹلوں، کاروباری مراکز، پیٹرولیم کمپنیوں اور اسٹیل ملز (Steel Mils) نے وسیع پیمانے پر خاص طرز کے کارڈ جاری کیے، جو صرف انہی مذکورہ بالا اداروں میں استعمال کیئے جاسکتے تھے۔ اسی بنیاد پر ۱۹۲۴ء کو جنرل پیٹرولیم کارپوریشن(Genrel Petroliam Corp) نے عمومی سطح پر کیلی فورنیا میں ایک حقیقی کریڈٹ کارڈ جاری کیا، تاکہ اس کمپنی سے پیٹرولیم مواد خریدنے والے کسٹمرز اس کارڈ کی بنیاد پر فی الفور ادائیگی کے بجائے بعد کی مقرر تاریخوں میں پیمنٹ (Payment) کر سکیں(۷) ۱۹۲۴ء کے بعد ڈائنرز کلب(Diner's Club) کے نام سے جو کمپنی نے کریڈٹ کارڈ جاری کیا، اس کی ابتدا اور کارڈ جاری کرنے والے سال کے بارے میں دو قول ہیں: بعض حضرات جیسے ڈاکٹر بکر بن عبداللہ أبوزید (۸) رکن اللجنة الدائمة للإفتاء والبحوث اور ڈاکٹر محمد علی القری بن عید(۹) رکن مرکز أبحاث الاقتصاد الإسلامي، جامعة الملك عبدالعزيز، جدہ اور جناب فتحی شوکت صاحب، نابلس فلسطین(۱۰) کے نزدیک(Diner's Club) کے نام سے کارڈ جاری کرنے والی کمپنی ۱۹۴۹ء میں قائم کی گئی، ابتداء اس کمپنی نے صرف شام کا کھانا ہوٹلوں میں کھانے والوں(Diner's) کے لیے کارڈ کا اجراء کیا(۱۱)

Diner's Club کے بعد امریکن ایکسپریس (American Express)اور کارٹ بلانچ (Carte Blanch)میدان میں آئے، پھر ۱۹۵۱ء م میں بینکوں نے اس طرف پیش قدمی کی۔ نیو یارک، امریکہ میں فرانکلین نیشنل بینک (Franklin National Bank)نے کریڈٹ کارڈ جاری کیا۔کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ ادائیگی کے نظریہ کی کامیابی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسال کے قلیل عرصہ میں صرف امریکہ کی مختلف ریاستوں میں سو[۱۰۰]کے قریب بینکوں نے کارڈ جاری کرنا شروع کیا۔ ۱۹۵۵ء میں(First Nationat Bank of Bostan)نے(Ckeek Credit plans)کے نام سے کریڈٹ کی دنیا مین ایک نیا پلان پیش کیا،جس کی وجہ سے کریڈٹ کارڈ نے مزید ترقی کی راہیں طے کیں۔اس خاص پلان کا مقصد بینکوں کے صارفین کومشینوں کے ذریعے بسہولت قرضے فراہم کرنا تھا۔بینکوں نے اس حوالے سے مزید پیش رفت کی یہاں تک کہ کارڈ ہولڈر کی طرف سے جاری ہونے والے چیک(Cheque Guarantee Card)اوراس میں لکھی ہوئی رقم کی ادائیگی کی ضمانت بھی بینکوں نے قبول کرنی شروع کر دی(۱۲)۱۹۵۹ء میں امریکہ کے سب سے بڑے بینک(Bank of Amrica) نے بھی کریڈٹ کارڈ جاری کرنا شروع کیا(۱۳)۔اسے (Chase Bank) کا تعاون بھی حاصل تھا۔ ان دونوں بینکوں کا اشتراک (Chase Manhatten)کے نام سے جانا جاتا تھا(۱۴)۔Bank of Amrica نے کارڈ کی مانگ اور چلت کو دیکھتے ہوئے دیگر بینکوں کے تعاون سے(National Bank America Card Crop) کے نام سے'' کریڈٹ کارڈ'' جاری کرنے اوراس کے تمام معاملات کے لیے ایک ادارہ قائم کیا(۱۵)۔بینکوں کے اسی مذکورہ تعاون اور باہمی اشتراک کے نتیجے میں ماسٹر کارڈ وجود میں آیا، جو(First National Bank of tuisuiolle) کی ملکیت تھا۔اس کارڈ کوعوام کی طرف سے زبردست پذیرائی حاصل ہوئی(۱۶)۔ Master Card کی شاندار کامیابی کے بعد ۱۹۷۷ء میں بعض بینکوں نے باہمی تعاون اشتراک کے نام سے(Visa Carporation)کے نام سے ایک اور ادارہ بنایا، جو(Visa)کے نام سے کریڈٹ کارڈ اور دیگر کارڈ جاری کرنے لگا۔(۱۷)اس دوران عالمی سطح پر کریڈٹ کارڈز نے رواج وشہرت پائی،امریکن ایکسپریس(American Express) ماسٹر کارڈ(Master Card) یورو کارڈ (Euro Card)وغیرہ۔(۱۸) کریڈٹ کارڈ کی بے انتہا مقبولیت،شہرت اور رواج نے کارڈ جاری کرنے والے اداروں کو بین الاقوامی کمپنیوں کا مقام دیا، یہاں تک کہ ان کمپنیوں نے خود کارڈ جاری کرنے کے بجائے،مختلف کارڈ جاری کرنے والے بینکوں کوممبر بنانا شروع کیا۔ممبر کو اس حوالے سے اصول وضوابط بنا کر دیئے،اور کریڈٹ کارڈ کے معاملات کی نگرانی

کے بدلے یہ کمپنیاں ممبر بینکوں سے کمپنی کے نام سے کارڈ جاری کرنے پر اجرت وصول کرتی ہیں۔(۱۹)

کارڈ جاری کرنے والی کمپنیوں کا تعارف

عالمی سطح پر مذکورہ بالا کمپنیاں براہ راست یا بینکوں کے واسطے سے مختلف نوعیت کے کریڈٹ کارڈ جاری کرتی ہیں، ان میں سے بعض کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ویزا انٹرنیشنل(Visa International)''ویزا''(Visa)ایک ایسی تنظیم اور کمپنی کا نام ہے، جو دنیا کے مختلف خطوں میں موجود ممبر بینکوں کو کریڈٹ کارڈز کے حوالے مختلف انواع کی خدمات مہیا کرتی ہے، بینکوں کے داخلی نظام میں دخل دیئے بغیر مذکورہ بالا کمپنی فیس لے کر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔''ویزا'' کے دو بڑے شعبے ہیں:(الف)۔USA Visa یہ امریکہ میں ''ویزا'' کے نام سے کریڈٹ کارڈ کے معاملات کو سنبھالتی ہے۔(ب)۔ ویزا انٹرنیشنل (Visa International)یہ بین الاقوامی اور عالمی سطح پر خدمات انجام دے رہی ہے اور دنیا کے ۱۳۶ سے زائد ممالک میں اس کی برانچیں ہیں۔(۲۰) ویزا انٹرنیشنل تین طرح کے کارڈ جاری کرتی ہے:۱۔ بطاقة الفیزا الفضیة(Visa Silver Card)۲۔ بطاقة الفیزا الذہبیة(Visa Golden Card)۳۔ بطاقةالفیزا الإلکترون(Visa Electronic Card)۔(۲۱)امریکن ایکسپریس(American Express) یہ عالمی سطح کا ایک بہت بڑا بینک اور مالیاتی ادارہ ہے، بینکوں سے متعلق مالیاتی امور کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ کارڈ بھی جاری کرتا ہے، امریکن ایکسپریس کے نام سے مشہور و معروف ہے۔امریکن ایکسپریس تین طرح کے کارڈ جاری کرتا ہے،اور امریکن ایکسپریس گرین کارڈ(American Express Green Card)،۲۔امریکن ایکسپریس گولڈن کارڈ(American Express Golden Card)،۳۔امریکن ایکسپریس ڈائمنڈ کارڈ(American Express Diamond Card)۔(۲۲)ماسٹر کارڈ(Master Card):ماسٹر کارڈ انٹرنیشنل مارکیٹ میں ایک جانا پہچانا اور معروف نام ہے، ۲۳۰۰ سے زائد مالیاتی اداروں کو اپنے صارفین سے معاملات کرنے میں ماسٹر کارڈ کا تعاون حاصل ہے۔''ماسٹر کارڈ اور ویزا کارڈ'' کے (۲۰۰۰۰) سے زائد مالیاتی ادارے ممبر ہیں، جو دنیا کے مختلف اطراف و اکناف میں صارفین کو سہولیات فراہم کر رہے ہیں۔اکسیس پرائیویٹ لمیٹڈ(Access Private Limitde):برطانیہ میں کارڈ جاری کرنے اور ان کے ذریعے مالیاتی لین دین میں

بینکوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ایک کمپنی جو اسیس پرائیویٹ لمیٹڈ کے نام سے مشہور ہے، چار برطانوی بنکوں کے باہمی تعاون سے وجود میں آئی ہے، وہ چار بینک درج ذیل ہیں: ۱۔لویڈاس بینک(Lovidas Bank)۲۔میڈلانڈ بینک(Maidelande Bank)۳۔نارتھ ویسٹرتھ بنک(North Whersth Bank)۴۔نیشنل بینک آف اسکاٹ لینڈ(National Bank of Iskatland)۔(۲۳)

بارکلیز کارڈ(Bar Clay'scard): بارکلیز کارڈ کے نام سے یہ کارڈ بھی برطانیہ کا ایک بینک بارکلیز بینک جاری کرتا ہے۔ ان دونوں کمپنیوں نے اپنے کارڈوں کی مانگ اور چلت کی وجہ سے انہیں عالمی حیثیت دینے کی پالیسی اپنائی، (Access) نامی کمپنی نے ماسٹر کارڈ انٹرنیشنل سے۔اس حوالے سے معاہدات کیے، جس کے نتیجے میں جہاں جہاں ماسٹر کارڈ قبول کیا جاتا ہے، وہاں پر Access والوں کا کارڈ بھی استعمال کیا جانے لگا۔اس طرح بارکلیز بینک نے ویزا(Visa) کمپنی سے تعاون حاصل کیا، اوراپنے صارفین کو انٹرنیشنل سطح پر''ویزا'' کے مراکزاور''ویزا'' کارڈ کی طرح کارڈ استعمال کرنے کی سہولت فراہم کی، لہٰذا جہاں بھی''ویزا کارڈ'' مستعمل ہے وہاں پر بارکلیز کارڈ کے ذریعے بھی خرید وفروخت اور دیگر سہولیات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

کریڈٹ کارڈ کی لغوی تعریف

کریڈٹ کارکو عربی میں ''البطاقة الائتمانية'' کہتے ہیں، چوں کہ عربی میں یہ دولفظوں سے مل کر بنا ہے، لہٰذا ان میں سے ہرایک کی علیحدہ تعریف کے بعد پھر مجموعہ کی تعریف ذکر کی جائے گی۔ بطاقۃ کی تعریف بطاقات، بطاقۃ کی جمع ہے، کتابۃ کے وزن پر، جیسے کہ صاحب تاج العروس نے ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''البطاقۃ بمعنی الورقۃ'' کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے کو کہا جاتا ہے، جب کہ علامہ جوہری کہتے ہیں کہ کپڑے پر چسپاں اس رقعے کو کہا جاتا ہے۔جس میں سامان کی قیمت، وزن یا عدد مذکور ہوتا ہے۔بعض حضرات اسے مصری زبان کا لفظ قرار دیتے ہیں جب کہ دوسرے بعض اسے مصری زبان کے ساتھ مقید نہیں کرتے، بلکہ اسے عام قرار دیتے ہیں۔ ابن سیدہ فرماتے ہیں کہ ابن الاعرابی کا قول اس بارے میں صحیح ہے کہ یہ ورقہ کے معنی میں ہے۔(۲۴) خلاصہ یہ ہوا کہ بطاقۃ ایک فصیح عربی کلمہ ہے اور یہ کاغذ (کے ٹکڑے) یا پرچی کے معنی میں مستعمل ہے، یہی بطاقات کا اصلی معنی ہے، پھر زمانے کے گزرنے کے ساتھ اس میں ترقی ہوئی اور یہ دھات سے بنایا جانے لگا، اس پر کارڈ نمبر اور حامل کارڈ کا نام کھدا ہوا ہوتا ہے، پھر اس میں مزید ترقی ہوئی اور یہ پلاسٹک سے بنایا جانے

لگا۔(۲۵)

کارڈ کی فنی اور اصلاحی تعریف:

پلاسٹک کا بنا ہوا ۵.۵ سینٹی میٹر سے ۸.۵ سینٹی میٹر تک کا ایک مستطیل ٹکڑا جس پر حامل کا نام، تاریخ اصدار وانتہاء، کارڈ جاری کنندہ کا نام، اور حامل کارڈ کی ظاہری علامت (اگر موجود ہو تو) جلی حروف میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔کارڈ کی عالمی کمپنی اور بینک کی مخصوص علامت واضح طور پر پرنٹ ہوئی ہوتی ہے۔اس کی پشت پر بعض اہم معلومات درج ہوتی ہیں، جیسے کارڈ کی نوعیت، اس کا سیریل نمبر اور کارڈ ہولڈر کا شخصی نمبر، بینک اور کارڈ جاری کنندہ کی مہر اور کارڈ حاری کنندہ کا رابطہ اور پتہ اور کارڈ ہولڈر کے دستخط وغیرہ۔(۲۶)

کریڈٹ (الائتمان) کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

کریڈٹ انگریزی زبان کی اصطلاح ہے۔کریڈٹ عصر حاضر کے معروف معنی میں پہلے استعمال نہیں ہوا، البتہ اس کے شواہد اور استیناس بعض حضرات نے ذکر کیے ہیں، جو آگے جا کر بیان کیے جائیں گے۔کریڈٹ (Credit) کے معنی کے بارے میں اقتصادیات سے بحث کرنے والے معاصر علماء میں اختلاف ہے، اس میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ کریڈٹ (الائتمان) قرض کے معنی میں ہے، جیسا کہ ڈاکٹر عبدالوہاب ابوسلیمان کی رائے ہے، جب کہ ان کے علاوہ باقی حضرات اسے اعتماد کے معنی میں لیتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی تفصیل پیش خدمت ہے۔قول اول: کریڈٹ بمعنی الإقراض: ڈاکٹر ابوسلیمان عبدالوہاب کہتے ہیں کہ عام طور سے ماہرین اقتصادیات اور بینکار جضرات کریڈٹ کا ترجمہ الائتمان (بمعنی اعتماد) کے کرتے ہیں ، اور وہ اسے کریڈٹ کا ترجمہ قرار دیتے ہیں، جب کہ انگلش ڈکشنریوں کی مراجعت سے اس کے بہت سارے معانی سامنے آتے ہیں ۔ عام طور سے اس کا اطلاق آدمی کے مرتبے، اس کی عزت وتوقیر اور نسبت پر ہوتا ہے۔کسی کی برابری کا اعتراف کرنا، اچھی شہرت، ابتداء واعتماد اور بینک میں موجود اسکے اکاؤنٹ اور بیلنس کو بھی انگریزی میں کریڈٹ کہتے ہیں۔اسی طرح ثمن کی ادائیگی میں معتمد ہونے کی وجہ سے اس کی ادائیگی سے قبل اپنی ضروریات کے حصول پر قدرت پانا، کسی کے حصوں کا اعتراف کرنا، امتحان میں امتیازی مرتبے سے کامیاب ہونے کی وجہ سے ملنے والے بلند علمی مرتبہ، اور تجارتی معاملات میں شہرت اور مرتبہ وغیرہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔(۲۷) یہی وہ معانی ہیں جن سے ائتمان کے معنی کی تخصیص ہوتی ہے جو کہ اس بحث کا محور ہے۔(Card) کے بھی بہت سارے معانی ہیں، ان میں سے سب سے مشہور اور معروف یہ

ہے کہ کارڈ پلاسٹک کے بنے ہوئے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں، جسے کوئی بنک جاری کرتا ہے، یا کوئی اور ادارہ ،کارڈ ہولڈر کے لیے، اس پر کارڈ ہولڈر سے متعلق بعض امور درج ہوتے ہیں، اگر کریڈٹ کے قبیل سے ہوتو اسے نقد رقم کے حصول یا دین کے حصول کی غرض سے جاری کیا جاتا ہے۔(۲۸)

قول ثانی: کریڈٹ بمعنی الثقہ (اعتماد):

عام ماہرین اقتصادیات کے نزدیک کریڈٹ اس اعتماد کو کہتے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی شخص یا مالیاتی ادارہ اسے مستقبل میں ادائیگی کی بنیاد پر ضروریات پوری کرنے کی قدرت دیتا ہے۔(۲۹) الائتمان "الأمان" اور "الأمانة" سے باب افتعال کا مصدر ہے، جب کہ الأمان، سچائی، اطمینان، عہد،طرف داری کو کہتے ہیں، اور مامون بہ (جس کے ذریعے دوسرے کو امن والا بنیا جاتا ہے) وہ اعتماد ہے۔(۳۰) ماہرین اقتصادیات کے نزدیک ائتمان کی تعریف یہ ہے کہ ''موجودہ قیمت (یعنی اشیاء سامان وغیرہ) کا تبادلہ کرنا اس کے برابر قیمت مؤجلہ کے وعدے کے مقابلے میں اور غالباً یہ قیمت نقد میں ہوتی ہے۔(۳۱) جب کہ بینک کی اصطلاح میں ایسے عقد کو کہتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ کسی شخص کو ایک معین مبلغ کا اعتماد جاری کرتا ہے۔(بطاقات الائتمان البنكية في الفقه الإسلامي: ۴۴) اور مالیاتی شعبوں میں ائتمان اس قرض کو کہتے ہیں جو بینک کسی بھی شخص کو فراہم کرتا ہے۔(۳۲)

کریڈٹ کارڈ کی اصطلاحی تعریف:

مجمع الفقہ ال إسلامی جدہ نے اپنے ایک اجلاس جو ۷۔۱۲/۱۱/۱۴۱۲ھ میں ہوا، قرارداد نمبر (۵۶/۱/۷) کے ذریعے کریڈٹ کارڈز کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے:''یہ ایک سند ہے، جو جاری کنندہ ایک عقد کی بناء پر کسی شخص حقیقی یا معنوی کو فراہم کرتا ہے، اور وہ اس کو اس سند کے ذریعے اشیاء کی خریداری اور سہولیات کے حصول پر قدرت دیتا ہے، اس پر فوری ادائیگی واجب نہیں ہوتی ، کیوں کہ جاری کنندہ اس کی طرف سے ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے(اس شرط پر کہ وہ بعد میں اسے ادا کر دے گا، بعض جاری کنندہ ایک معین مدت کے بعد غیر ادا شدہ بلوں کی مقدار پر جرمانے کے نام سے سودی فوائد حاصل کرنے ہیں''۔(۳۳) بعض حضرات نے (Debit Card) اور (Charge Card) کو بھی کریڈٹ کارڈز کی عمومی تعریف میں داخل کیا ہے، جب کہ وہ اس کی تعریف میں اصالتاً نہیں

، بلکہ تغلیباً داخل ہوتے ہیں۔کریڈٹ کارڈ (Credit Card) کوعربی میں: ''بطاقۃ ال اِقراض بزیادۃ ربویۃ والتسدید علی أقساط'' (۳۴)، ''بطاقۃ الائتمان ال اِقراضیۃ'' (۳۵)، اور ''بطاقۃ الائتمان'' بھی کہتے ہیں۔(۳۶) یعنی سودی بنیادوں پر قرض فراہم کرنے والا اور قسط وار ادائیگی کا کارڈ۔کریڈٹ کارڈ کی اب تک پانچ اقسام وجود میں آئی ہیں:-ا عام کارڈ، یا سلور کارڈ، -۲ ممتاز کارڈ، یا گولڈن کارڈ (۳)، -۳ پلاسٹک کارڈ (Premium Card) (۳۸)، -۴ گولڈ کارڈ، -۵ کو برانڈیڈ کارڈ (Co-branded Card)۔(۳۹)

(۱) العثماني، المفتي محمد تقی حفظہ اللّٰہ، انعام الباری، کتاب الحوالات، کریڈٹ کارڈ: ۶/ ۴۹۱، ۴۹۲، مکتبۃ الحراء کراتشي۔

(۲) مجلّۃ مجمع الفقہ الإسلامي، بطاقات الائتمان، نبذۃ تاریخیۃ للبطاقات المصرفیۃ: ۱۰۶۳/۸، ۱۰۶۴، جدہ۔

(۳) بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ کے شرعی احکام، فقہ اکیڈمی، انڈیا، سوالنامہ، ص: ۱۵، دار الاشاعت کراچی، ۲۰۰۸ء م۔

(۴) حوالا سابق، ص: ۸۳۔

(۵) الزحیلي، وہبۃ مصطفی، بطاقات الائتمان، تحت عنوان: ''تقدیم''، ص: ۱، بحث و محاظرۃ ألقاہا الدورتہ الخامس عشر في مسقط (سلطنۃ عمان) ۲۰۰۴ء م۔

(۶) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ کے شرعی احکام، اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا، ص: ۱۱۹، ۱۲۱، درالاشاعت کراچی ۲۰۰۸ء۔

(۷) الوثائق، الوثیقۃ (رقم: ۱) بحث عن بطاقات الائتمان المصرفیۃ والتکییف الشرعي المعمول بہ، في بیت التمویل الکویتي، اعداد: مرکز تطویر الخدمۃ المصرفیۃ، بیت التمویل الکویتي، بحث منشور في مجلۃ مجمع الفقہ الإسلامی بجدۃ: ۳۴۳/۷۔

(۸) أبو زید، بکر بن عبد اللّٰہ، بحث عن بطاقۃ الائتمان، ص: ۵، ۴، الطبعۃ الثانیۃ: ۱۴۱۷ھ، السعودیۃ۔

(۹) بطاقات الائتمان للدکتور محمد علی القري بن عید، نبذۃ تاریخیۃ، بحث منشور في مجلۃ المجمع الفقہ الإسلامي بجدہ: ۲۹۳/۷۔

(۱۰) بطاقات الائتمان البنكية في الفقه الإسلامي، ص: ۸، جامعة النجاح الوطنية، نابلس فلسطين، ۲۰۰۷م۔

(۱۱) دیکھیئے: کریڈٹ کارڈ کے شرعی احکام، مولانا محمد اسامہ، ص: ۳۱، ۳۲، دارالاشاعت کراچی، کریڈٹ کارڈ، تاریخ، تعارف، شرعی حیثیت، ڈاکٹر شاہتاز: ۱۴، اسکالرز اکیڈمی گلشن اقبال کراچی ۱۹۹۸ء۔

(۱۲) القري، محمد علي بن عيد، بطاقات الائتمان: ۲، مجلة مجمع الفقه الإسلامي: ۷/۴۹۳، ۴۹۴، جده۔

(۱۳) بطاقات الائتمان البنكية في الفقه الإسلامي، ص: ۸۔

(۱۴) بطاقات الائتمان للدكتور علي القري، ص: ۲، مجلة مجمع الفقه الإسلامي: ۷/۴۹۴۔

(۱۵) بطاقات الائتمان لفتحي شوكت، ص: ۴۔

(۱۶) بطاقات الائتمان للدكتور علي القري، ص: ۳۔

(۱۷) بطاقات الائتمان لفتحي شوكت، ص: ۸۔

(۱۸) بحث عن بطاقات الائتمان المصرفية والتكييف الشرعي المعمول به، في بيت التمويل الكويتي، اعداد: مركز تطوير الخدمة المصرفية، بيت التمويل الكويتي، بحث منشور في مجلة مجمع الفقه الإسلامی بجدة: ۷/۳۴۵۔

(۱۹) بطاقات الائتمان للدكتور علي القري، ص: ۳، مجلّة مجمع الفقه الإسلامي: ۷/۴۹۴۔

(۲۰) بطاقة الائتمان لبكر بن عبد الله، ص: ۵، وبطاقات الائتمان المصرفية والتكييف الشرعي المعمول به، في بيت التمويل الكويتي، ص: ۵۔

(۲۱) بطاقة الائتمان البنكية فيا لفقه الإسلامي، ص: ۲۶۔

(۲۲) البطاقات البنكية للدكتور أبي سليمان عبد الوہاب، المصدرون للبطاقات عالمياً، ص: ۳۴، دار القلم دمشق ۲۰۰۳م، ۱۴۲۴ھ۔

(۲۳) المرجع السابق، ص: ۳۶۔

(۲۴) الأفريقي، ابن منظور، لسان العرب، تحت مادة ب ت ق: ۱/۱۰۱، قديمی کراتشي۔

(۲۵) البطاقات الائتمانية، تعريفها وأخذ الرسوم على إصدارها والسحب النقدی بها: ۲، ۱۔

(۲۶) البطاقات الدائنية للعصيمي: ۹۵۔

The Concise Oxford Dictionoey(Printed in U.S.A Cretid Card
(27)PO272بحوالہ:البطاقات البنكية للدكتور
عبدالوہاب:۲۰۔
(۲۸)المرجع السابق۔
(۲۹)البطاقات الائتمانية للدكتور صالح بن محمد الفوزان،ص:۲۔
(۳۰)محيط المحيط لبطرس البستاني،ص:۱۷، مكتبة لبنان بيروت۔
(۳۱)النظرية الاقتصادية،أحمد جامع:۲۴/۲،دار النهضة العربية،القاہرة۔
(۳۲)موسوعة المصطلحات الاقتصادية،ص:۳،مكتبة القاہرة الحديثية۔
(۳۳)مجلة مجمع الفقه الإسلامي،ع۱۲،ج:۳:۶۷۶۔
(۳۴)البطاقات البنكية:۲۶۔
(۳۵)بطاقات الائتمان البنكية:۲۲۔
(۳۶)بطاقات الائتمان المصرفية(بيت التمويل الكويتي)مجلة المجمع:۳۴۷/۷۔
(۳۷)البطاقات الائتمان البنكية،للدكتور عبدالوہاب أبي سليمان،ص:۶۷۔
(۳۸)بطاقات الائتمان للزحيلي:۱۰۔
(۳۹)بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ کے شرعی احکام،ص:۵۰۔

عمر جاوید

کیا کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے؟

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے کے فلسفے کی نسبت سے ہمارے ملک کی مذہبی سیاسی جماعتوں میں اس بات کا رجحان پایا جاتا ہے کہ ملک کے اداروں میں اپنے نظریے کے لوگوں کو داخل کر کے ان اداروں سے کچھ خیر کی امید رکھی جاسکتی ہے. جیسے جیسے ان اداروں میں دین دار لوگوں کا اضافہ ہوتا چلا جا؟ گا ویسے ویسے وہ ادارہ یا ادارے شر سے پاک ہوتے چلے جائیں گے. مزے کی بات یہ ہیں کے ویسے تو جماعت اور جمیعت کے لوگ ایک دوسرے کے مدمقابل نظر اتے ہیں لیکن اس نظریے پر متفق ہیں. جمیعت کی پشت پناہی کرنے والے علماء؟ دیو بند بھی شائد اس نظریے سے کرتے ہیں.

بظاھر تو اس نظریے کی ابتدا پاکستان بنے کے بعد مولانا مودودی اور مفتی محمود کی تحریک سے ہوتی نظر اتی ہے لیکن کچھ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہیں کے وہ دراصل سر سید احمد خان صاحب تھے جنہوں نے اس نظریے کی داغ بیل ڈالی. اگر اس بات کو سہی تسلیم کر لیا جا؟ تو اس نظریے کی عمر کوئی ۱۵۰ سال ہو جاتی ہے. اس پورے عرصے میں اس نظریے سے اتفاق کرنے والوں کی تعداد میں خاطر خوا اضافہ ہوا ہے اور آج اک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کے نیک اور ایمان دار لوگوں کو مختلف ریاستی اداروں کا حصہ بنا کر ان اداروں کو شر سے پاک کیا جا سکتا ہے.

اگر ہم یہ دیکھیں کے پچھلے ؟؟ سالوں میں جو مذہبی جماعتوں نے تگو دو کی ہے، اس کے نتیجے میں کل ریاستی اداروں میں کتنے فیصد ان کے ہم خیال لوگ پہنچے ہیں؟ اور ان لوگوں نے ان ریاستی اداروں کو شر سے پاک کرنے میں کوئی کامیابی حاصل کی ہے؟ کیا آج یہ کہا جا سکتا ہے کے اگر ہم اسی طرح چلتے رہے تو اگلے ۲۰ یا ۴۰ یا ۶۰... سالوں میں انشااللہ کچھ مثبت تبدیلی انے کے امکانات ہیں؟ زمینی حقائق کی روشنی میں ان باتوں کا جواب شاید مثبت نہ ہو. بلکے اس بات کے زیادہ ثبوت موجود ہیں کے ان اداروں کے مرہون منت معاشرے میں شر آج اور زیادہ تیزی سے پھیل رہا ہے، اور اگر اس کا مقابلہ کوئی کر رہا ہیں تو وہ اٹے میں نمک کے برابر خلوص نیت لوگ نہیں جو ان ریاستی اداروں میں کام کرتے ہیں بلکہ روایتی دینی جماعتیں یا ادارے ہیں مثال کے طور پر تبلیغی جماعت اور مساجد وغیرہ. یہاں سوال یہ ہے

کے اگر پاکستان کی ۶۵ سالہ تاریخ میں اس نظریے کے سہی ہونے کے ثبوت موجود نہیں تو آج ان مذہبی جماعتوں کے لیڈران ایک منٹ رک کر یہ کیوں نہیں سوچتے کے شاید یہ نظریہ اور طریقہ کار شاید ٹھیک نہیں اور کسی متبادل کی ضرورت ہے؟

اس مضمون میں ہم یہ دیکھیں گے کے نہ صرف یہ نظریہ مغالطہ آریوں پر مبنی ہیں بلکے اس پر اندھی تقلید کے نتیجے میں وقت اور افرادی قوت کے ضایع ہونے کی صورت میں قوم کو نا قابل تلافی نقصان بھی ہو رہا ہے. راقم کی نظر میں اس کی بنیادی وجہ کچھ مندرجہ ذیل مفروضات ہیں جو مذہبی جماعتوں نے انگریزوں کے بنائے ہوے ریاستی اداراتی ڈھانچے کے بارے میں فرض کیے ہوے ہیں.

مفروضہ نمبر ایک: ایک ادارہ ایک اوزار کی طرح ہوتا ہے اور اس کو استعمال کرنے والا مثبت یا منفی طریقے سے استعمال کر سکتا ہے.

مفروضہ نمبر دو: ایک ادارے کا ماحول اس میں کام کرنے والوں پر اثر انداز نہیں ہوتا.

مفروضہ نمبر تین: جس طرح کوئی بھی فرد یا گروہ ایک ہجوم کا حصہ بن سکتا ہے، اسی طرح کوئی بھی اپنی مرضی سے کسی بھی ادارے کا حصہ بن سکتا اور ادارہ کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کرتا.

مفروضہ نمبر چار: ایک ادارے کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں ہوتا اور وہ دوسرے اداروں سے الگ تھلگ ہو کر کچھ بھی کرنے کا مجاز ہوتا ہے.

مفروضہ نمبر پانچ: ادارے کے اعلی حکام بلخصوص اس بات پر قادر ہوتے ہیں کے وہ ادارے کے اندرونی نظام میں اور اس کی نظریاتی بنیادوں میں بلا روک ٹوک تبدیلی کر سکیں.

مفروضہ نمبر چھ: ادارے کے اندر کام کرنے والوں کے پاس اتنا ٹائم ہوتا ہے کے وہ ادارے کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کی منصوبہ بندی کریں اور اس منصوبے ک عملی جامہ بھی پہنا ئیں، اور کسی بھی قسم کی تبدیلی کو ادارہ اور تمام اسٹیک ہولڈرز بخوشی تسلیم بھی کر لیں.

کوئی بھی شخص جس نے کسی بھی ادارے میں کام کیا ہو وہ ان مفروضوں کو بے بنیاد قرار دے سکتا ہے. کچھ تفصیل کے ذریے بات انشااللہ مزید واضے ہو جائے گی.

کسی بھی معاشرے میں سماجی، معاشی، یہ ریاستی ادارے معاشرے کی ضروریات اور نظریات کے مطابق ایک تاریخی عمل کے ذریے وجود میں اتے ہیں اور مسلسل ارتکائی مراحل سے گزرتے رہتے ہیں. برصغیر میں جو معاشی اور ریاستی ادارے کام کر رہے ہیں وہ سب کو معلوم ہے کے انگریز اپنے ساتھ

لے کر آئے اور برصغیر کی عوام پر زبردستی مسلط کیے۔ پاکستان میں ابھی تک یہی ادارے برائے نام کام کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کے یہ ادارے مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی ضروریات اور نظریات کے تکازوں کو پورا کرنے کے اہل نہیں۔ سوال یہ ہے کے کیا ان اداروں میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے کیا وہ مذہبی جماعتوں کے گمان کردہ درج بالا طریقے سے آسکتی ہے؟

اس کے جواب میں کچھ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی ادارتی نظام کے لیے ضروری ہے کے وہ کچھ اصولوں پر چلتا ہو اور اس میں کام کرنے والے ان اصولوں کے پابند ہوں۔ ان اصولوں کے مطابق ادارے کے داخلی اور خارجی پالیسی مرتب ہوتی ہے۔ یہ اصول ادارے، اس کے شعبوں اور اس میں کام کرنیوالے ملازمین کی کارکردگی جانچنے کا پیمانہ بھی بتاتے ہیں۔ اس اصولی ڈھانچہ کا ارتکا ایک تاریخی عمل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتا ہیں۔ اوپر سے لے کے نیچے تک ہر شخص پر ان اصولوں کی پابندی لازمی ہوتی ہے اور خلاف ورزی پر وہ سزا کا مستحک بھی ہوسکتا ہے، اور اگر خلاف ورزی سنگین نوعیت کی ہے تو اس شخص کو نوکری سے فارغ بھی کیا جاسکتا ہیں۔ ادارے میں ہر ملازم کی زمیداریوں کے حدود کا دائرہ بھی اسی اصولی ڈھانچے کا حصہ ہوتا ہے، تمام ملازم اپنی حدود میں رہ کر کام کرتے ہیں اور کسی دوسرے کی حدود میں قدم رکھنا ایک غلط بات سمجھا جاتا ہے، اگر کوئی ملازم اپنی حدود تجاوز کر کے کسی دوسرے ملازم کے دائرہ کار میں دخل اندازی کرے تو ممکنہ طور پر اس کے خلاف بھی ادارہ کروائی کرسکتا ہے۔ ہر ملازم کی اخلاقی زمیداری بھی اس کے کام کے حدود تک ہی محدود ہوتی ہے، اور وہ کسی دوسرے ملازم کی کسی بھی غیر اخلاقی حرکت کا ذمیدار نہیں ہوتا۔ ادارے میں بھرتی یا ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کے ملازم ادارے کے اصولی ڈھانچے اور نظریات پر کامل یقین رکھ کر ان کے مطابق چلنے پر تیار ہو، اگر نہیں تو اس کو نوکری ملنا مشکل ہوتا ہے، اور اگر مل بھی جا؟ تو کچھ عرصے کے بعد اس کو نوکری سے فارغ کر دیے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ ادارے کا نظام ہر ملازم کی کارکردگی اور اصولوں کو پابندی کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی رکنیت بھی شایدانہی اصولوں پر قائم ہوتی ہیں۔

ایک اور بات سمجھنا ضروری ہے کے ادارے میں کام کرنے والے کا ادارتی کردار اور اس کا انفرادی کردار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ادارتی کردار کا تعلق ان زمیداریوں سے ہوتا ہے جو اس ملازم کو سونپی جاتیں ہیں یا وہ ملازم اس ادارے میں اپنی ملازمت کے تحفظ کی وجہ سے مجبور ہو کر سرانجام دیتا ہے۔ ان زمیداریوں کو سرانجام دینے کیلیے ملازم اپنی انفرادی حیثیت میں پوری ایمان داری سے کام کرتا ہو، لیکن ان زمیداریوں کے حق و باطل ہونے کا اس کی ایمانداری سے کوئی تعلق نہیں۔ مثال کے طور پر ایک بینک کا ملازم پوری ایمان داری سے سودی لین دین کرسکتا ہے، ایک پارلیمنٹ کثرت رائے سے

پوری ایمانداری کے ساتھ قرآن اور سنّت کے خلاف بل پاس کر سکتی ہے یا اسلامی نظریات کونسل کے حکم کے خلاف انسانی حقوق کا بہانہ بنا کر اپنی بات منوا سکتی ہے، کوئی اشتہار بنانے والی کمپنی میں کام کرنے والا اپنے کلائنٹ کی خواہش کے مطابق پوری ایمانداری سے فحاشی سے بھرپور اشتہار بنا سکتا ہے، اور وکیل پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی مجرم موکل کے لیے کیس لڑ سکتا ہے. کسی بھی ملازم کی ترقی کے لیے یہ لازم ہے کے وہ اپنے اس ادارتی کردار کو پوری ایمانداری سے نبھائے. ایسا کئی دہایوں تک کرنے کی بعد وہ ملازم ترقی کرتے کرتے ادارے میں اعلی حکام کی سطح تک پہنچتا ہے. یہ عین ممکن ہے کے ادارے کے اندر اپنی ملازمت کے تحفظ کے لیے ہر ملازم کو کرپشن، افسر شاہی، دھاندلی، اور سفارشی کلچر کا حصہ بننے کی ضرورت پیش اتی ہو. اور اگر یہ تمام خرافات ادارے کے سسٹم یا نظام کا حصہ بن چکیں ہوں تو ملازمت کے تحفظ کے لیے اور بلخصوص ترقی کے لیے ان تمام کالے کرتوتوں کا حصہ بننا ناگزیر ہو جاتا ہے. ایسی صورت حل میں جو ملازم ترقی کرتے کرتے اوپر پہنچ جایئں اور یہ تمام خرافات ان کے ایمان اور کردار کا حصّہ نہ بنیں یہ کسی معجزے سے کم نہیں. ایسی صورت حل میں یہ کوئی اچھمبے کی بات نہیں ہونی چاہیے کہ اگر کوئی ایماندار اور مخلص شخص کسی کرپٹ نظام میں داخل ہو گا تو اوپر پہنچتے پہنچتے یا تو خود کرپٹ ہو جائے گا یا پھر نظام اس کو کسی غیر موثر پرزے کی طرح بے دخل کر دے گا۔

. ایک ادارہ کسی جاندار کی طرح اندرونی اور بیرونی خطرات سے دفع کے لیے ایک مدافعتی نظام کا حامل ہوتا ہے اب اگر کوئی ایسا گروہ جو نظریاتی طور پر اس ادارے کے متضاد ہو وہ اس ادارے میں داخل ہونا چاہے ہو تو ادارہ لازمی طور پر اپنے دفع کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا، اور اگر یہ گروہ کسی طرح اس ادارے کے اوپر حاوی ہو جائے اور اپنی مرضی کے مطابق اس ادارے کا رخ بدل دے، بھلے یہ جائز طریقے سے ہی کیوں نہ ہو، دوسرے ادارے اس ایک ادارے کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے. مصر میں اخوان کو دوسرے اداروں نے جس طرح راستے سے ہٹایا ہے اس کی مثال سب کے سامنے ہے. اس کی وجہ یہ ہے کے ہر ادارہ دوسرے ادارے سے اس طرح منسللک ہوتا ہے جیسے ایک مشین کے مختلف پرزے.اس انگریز کے بنائے ہوئے نظام میں ہر ادارے کو اپنی بقا اور مالی مفاد کے لیے دوسرے اداروں کو ضرورت ہوتی ہے، اور دوسری طرف کوئی بھی ادارہ کسی بھی دوسرے اداروں پر حاوی نہیں ہو سکتا. بل خصوص ایک ایسا ادارہ جو نظام کے مالی مفاد کی رہ میں رکاوٹ ہو۔

اس خصوصیت کی وجہ یورپ کی مخصوص تاریخ ہے جہاں ایک بہت لمبے عرصے تک بادشاہت اور پاپاییت کے آمرانہ نظام نے یورپ کو پسماندگی کے اندھاروں میں دھکیلے رکھا. اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے جو تحریکیں چلیں انہوں نے بعد میں جو نظام مرتب کیا اور پوری دنیا میں کولونیل دور میں پھیلا یا اس

نظام میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کے کوئی بھی گروہ یا فرد پورے نظام پر حاوی نہ ہونے پائے.

اب اگر کوئی یہ کہے کے حاکمیت صرف اور صرف الل؟ کی ذات کی ہے اور اس کے بعد اس کے آخری نبیص کی ہے، اور اس کے بعد ائمہ اربعرح کے ہے، اور پھر اس کے بعد علماء اور فقہا کرام کی ہے اور وہ ہی تمام اہم فیصلے کریں گے اور پارلیمنٹ سمیت تمام ادارے علماء کرام کے اگے اپنا سر تسلیم خم کریں گے مثلاً قوم پر اور افواج پر جہاد کب فرض ہوگا، میڈیا کہاں تک آزاد ہوگا اور بنکاری کا سودی نظام چلے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ تو یہ سب کچھ انگریز کے بنائے ہوے اس نظام کو برداشت نہیں کہ ایک طبقہ وہ بھی فطرتاً مذہبی تمام اداروں پر حاوی ہو جائے۔

مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیتیں پاکستان بننے کے ابتدا میں شاید اس قابل نہیں تھیں کے وہ ایک نیا نظام مرتب کرتے چناچہ انہوں نے ۱۹۴۷ کے بعد انگریزوں کے چھوڑے ہوے ریاستی نظام کو کلمہ پڑھنے کو کوشش کی. قائد آزم نے ڈیپارٹمنٹ اف اسلامک ریکنسٹرکشن بنایا لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ خواب ہے رہ گیا.اس کے بعد قرارداد مقاصد کو پاکستانی کانسٹیٹیوشن کا حصہ بنانے کی کوشش بلکل ایسی تھی جیسے کسی بس کے اگے ایک پنکھا لگا کر یہ سمجھ لیا جا؟ کے اب بس اڑنے کے قابل ہو گئی ہے. کیا اس پنکھے والی بس کا ڈھانچہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کے ایک انتہائی تجربہ کر پائلٹ کی موجودگی میں بھی وہ جہاز کی طرح اڑنا شروع کر دے۔

انگریز کا بنایا ہوا یہ نظام ایک مشین کی طرح ہے جو کے انسان نما پرزوں سے چلتا ہے. ان پرزوں کو بنانے کے لیے جس فیکٹری کی ضرورت ہوتی ہے اسے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کہتے ہیں. انگریز جب اس نظام کو برصغیر میں لے کر آئے تو انھوں نے دوسرے اداروں کے ساتھ پورا تعلیمی نظام بھی متعارف کروایا. اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کے اس فیکٹری کی پروڈکٹ ذہنی اور قلبی طور پر اس قابل ہوں کے وہ مشین کے پرزے کی طرح بن چوں چرا ان اس نظام کا کار آمد حصہ بنے کو ہی زندگی کا مقصد سمجھے. اس بات کو ممکن بنانے کے لیے کالجوں وغیرہ کا نظام بھی کچھ اسی طرح مرتب کیا گیا ہے کے ہر فرد ایک ہی فیلڈ میں مہارت حاصل کر پاتا ہے اور جب وہ نظام میں اکر نوکری کرتا ہے تو اس کو دوسرے شعبوں اور اداروں میں کام کرنے والوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے. یہ تعلیمی نظام لوگوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنی فیلڈ سے اگے ابھرنے نہیں دیتا اور نہ ان کی ذہنی نشونما اس طرح سے کرتا ہے کے وہ اس پورے نظام کو سمجھنے کے قابل ہو سکیں. نیز ان کی اخلاقی تربیت، تزکیہ نفس وغیرہ کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا

.اکبر الہ آبادی نے اسی نظام کے بارے میں کیا خوب کہا:

یوں قتل سے وہ بچوں کے بدنام نہ ہوتا

افسوس کے فرعون کو کالج کی نہ سوجی

کالج اور یونیورسٹی وغیرہ سے جو لوگ نکلتے ہیں وہ نچلی سطح سے مختلف اداروں کے مختلف شعبوں میں داخل ہوتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ بغیر کسی بھی چیز پر تنقید کیے یا سوال اٹھائے ادارے کے نظریات اور کلچر کے مطابق کام کرتے کرتے اعلی سطح تک پہنچتے ہیں. بھلے وہ کلچر کرپشن، دھاندلی، افسر شاہی، سفارش اور خودغرضی سے بھرپور ہی کیوں نہ ہو.

اب اگر کوئی جماعت اس نظام میں داخل ہو کر اس کو قابو کرنے کی کوشش کرے تو اس کی شروعات کہاں سے ہوں گی؟ کیا بیق وقت تمام اداروں کی اعلی سطح کی قیادت کو کسی طریقے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا ہر ادارے کی نچلی سطح سے داخل ہونے کی کوشش کی جا؟ یہاں چند سو یا چند ہزار لوگوں کی بات نہیں ہو رہی بلکے لاکھوں لوگوں کی بات ہو رہی ہے، یعنی ہم پورے تعلیمی نظام کو اپنے نظریات کے مطابق تبدیل کرنے کی بات کر رہیں ہیں، اب جو مشکلات کسی بھی ادارے کا حصّہ بن کر اس کو تبدیل کرنے کے حوالے سے پہلے بیان کی گئیں تھیں وہ تعلیمی نظام پر بھی حرف با حرف لاگو ہوتی ہیں

. اب جو مذہبی سیاسی جماعتیں نظام کا حصّہ بن کر اس کو شر سے پاک کرنے کی بات کرتیں ہیں، ان کے پاس پارلیمنٹ کا ایک ناکارہ حصہ بننے کا تو لاحے عمل ہے لیکن دوسرے اداروں کو اپنے نظریات کا تابے کرنے کا کوئی ممکنہ طریقہ موجود نہیں. وہ شاید اس مغالطے میں ہیں کے جب کبھی معجزاتی طور پر پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو افواج، عدلیہ، بیوروکریسی، میڈیا، سیول سوسائٹی، بنکاری نظام وغیرہ ان کے اگے اپنا سر تسلیم خم کر لیں گے. ایسا سوچنے والے شاید احمکوں کی جنّت میں رہتے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے مذہبی سیاسی جماعتوں کی سیاست میں ناکام شمولیت کے نتیجے میں بدنامی دین کی ہو رہی ہے. ایک عام آدمی جو مذہبی جماعتوں کے کارکنان کو ذاتی طور پر نہیں جانتا وہ ان جماعتوں کی سیاست میں شمولیت کی کوششوں سے یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کے ان جماعتوں کے مقاصد میں اور دوسری سیکولر اور کرپٹ جماعتوں کے سیاسی مقاصد میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکے مذہبی جماعتیں سیاست کے لیے اسلام کے نام کا ناجائز استعمال کر رہیں ہیں. انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے، تو جب مذہبی جماعتیں ماروسی طور پر کرپشن اور بددیانتی سے بھرپور سیاست کے میدان میں نظر آئیں گی تو ایک عام آدمی ان کے بارے میں مثبت گمان کیوں کر کرے گا؟ اور اگر یہ بات درست ہے تو اس بات کا

دین کے پھیلنے پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے اور ہو رہے ہیں اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے. اس کے برعکس دین کی خدمات کے حوالے سے اگر برصغیر میں تبلیغی جماعت، مدرسے اور مساجد کے نیٹ ورک کی خدمات کو دیکھا جائے تو اس کی مثال نہیں ملتی. اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز کے لادین نظام سے ان روایتی دینی اداروں کا کسی قسم کا براہراست کوئی تعلق نہیں. لیکن یہ بھی درست ہے کے ان روایتی دینی اداروں کا بہت سا کام جو کے نظریاتی نوعیت کا ہے ابھی کافی حد تک باقی ہے۔

اصل بات جو سمجھنے کے ہے وہ یہ ہے کے حقیقی جنگ نظام سے نہیں بلکے ان سیکولر اور لبرل نظریات سے ہے جن کے اوپر انگریزی نظام کھڑا ہے. نظام میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کے اس کے بنیادی سیکولر اور لبرل نظریات سے اتفاق کر لیا جائے۔یعنی کے نظام میں شمولیت کے بعد تبدیلی یا انقلاب کا نارہ بے معنی ہو جاتا ہے. میڈیا اس نظریات کی جنگ میں سب سے اہم کردار ادا کر رہا ہے. میڈیا کے برعکس دوسرے اداروں کا پاکستان کی اکثریت سے کوئی خاص رابطہ یا تعلق نہیں. پاکستان کی اکثریت کی زندگی مسجد، مدرسے، روایتی بازار، جرگہ یا پنچایت، روایتی خاندان، وغیرہ کے گرد گھومتی ہے، اور انکو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کے کون حکومت میں ہے، یا نہیں، وہ عام طور پر عدالتی نظام کا رخ نہیں کرتے، پولیس کی مدد حاصل نہیں کرتے، یا گورنمنٹ کے ہسپتالوں اور اسکولوں کا بھی رخ نہیں کرتے کیوں کے ان کو معلوم ہے کے ان کے اکثر مسلوں کا حل ان اداروں کے پاس نہیں۔

اسٹیٹ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بینک اکاؤنٹ ہولڈرز کی تعداد پوری آبادی کا صرف دس فیصد یا اس سے بھی کم ہے. یہ وہ تمام لوگ ہیں جو اپنی ماہانہ تنخواہ بینک میں وصول کرتے ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو ریاستی یا نجی اداروں میں ملازم ہیں. یعنی کے کل آبادی کا ۸۰ فیصد سے بھی کم اس ریاستی نظام سے اپنی معاشی ضروریات کے لیے براہے راست منسلک ہے. اس کا مطلب یہ ہے کے ملک میں اکثریت ان ریاستی اداروں اور مارکیٹ سسٹم پر براہراست انحصار کیے بغیر گزرا کر رہی ہے. ہمیں یہ بھی معلوم ہے کے پاکستان میں بہت سارے فلاحی ادارے اپنی مدد آپ کے تحت بغیر ریاستی مدد کے چل راہیں ہیں، ان میں پاکستان کے مدارس، مساجد کا نیٹ ورک اور تبلیغی جماعت جیسی تنظیمیں بھی شامل ہیں. میڈیا براہراست اس روایتی نظام کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور کرنے میں سرگرم ہے، اگر خدانخواستہ میڈیا اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو گیا تو یہ عین ممکن ہے کے چند سالوں میں مذہبی سیاسی جماعتوں کو اپنی نظریاتی سرحدوں کا دفع کرنا بھی مشکل ہو جائے۔

چناچے ایک کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کے ان روایتی اداروں کو اور زیادہ مستحکم اور کارآمد بنایا

جائے اوران کے دائرہ کارکومزید پھیلانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جایئں تاکے وہ اس نظریاتی جنگ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں. دوسری بات جوکرنے سے زیادہ سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کے تاریخ میں ایسی بیش بہا مثالیں موجود ہیں جن میں ایک پرانا اورفرسودہ ریاستی ڈھانچہ کی جگا ایک دوسرے ریاستی ڈھانچے نے لے لی ہو، مثال کے طور پر برطانیہ میں ابھی تک بادشاہ اور ملکہ موجود ہیں لیکن ان کا اثر ورسوخ ریاستی امور پر پارلیمنٹ کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے. انگریز جب برصغیر میں آئے تو انہوں نے مغلیہ سلطنت کے نظام کے ساتھ اپنا نظام کھڑا کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ پرانے نظام پر حاوی ہو گئے یہاں تک کے آج اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں. چین میں بھی کچھ ۶۰ سال پہلے کچھا ایسا ہی ہوا. ان تمام مثالوں سے یہ پتا چلتا ہے کے جب کوئی فرسودہ نظام کسی معاشرے میں جڑ پکڑ چکا ہوتو اس میں گھس کر اس کو تبدیل کرنے کے بجائے ایک نئے موثر نظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے جو کے آہستہ آہستہ پرانے نظام پر حاوی ہو جاتا ہے. لیکن اس سے پہلے لوگوں کی نظریاتی بنیادوں پر کام کیا جاتا ہے اور ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہیں جو متبادل نظام کی بنیاد رکھنے میں مددگار ثابت ہوں. اگر دیکھا جائے تو سرکار دوعالم حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مدینہ جا کر ایک نئے معاشرے اور نظام کی بنیاد رکھی، لیکن اس سے پہلے انہوں نے ۱۳ سال مکے میں صحابہ کرامؓ پر محنت کی.

پاکستان کی وہ اکثریت جس کا ذریع معاش انگریز کے فرسودہ نظام سے براہراست منسلک نہیں، ایک متبادل نظام کو کھڑا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، ایک ایسا متبادل جو مسجد، مدرسہ، روایتی بازار اور جرگہ سسٹم کو مزید بہتر، جامع اور کارآمد بنا کر کھڑا کیا جا سکتا ہے. اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کے کیا مذہبی سیاسی جماعتوں کا انتظامی ڈھانچہ اتنا لچکدار ہے کے وہ اپنے لائحہ عمل میں اتنی انقلابی تبدیلی لیکر آجائیں. اگر نہیں تو شاید وہ بھی اس مضمون میں بیان کی گی خصوصیت کے حامل ہیں. اگر وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں لا سکتے تو جہاں تبدیلی کی پوری قوم کو ضرورت ہے وہاں تبدیلی کیسے لے کر آیں گے؟ فیصلہ ان کے اپنے ہاتھ میں ہے.

عطا محمد جنجوعہ

روسو کا نظریہ

منشائے عام خلاف فطرت ہے

سترہویں صدی عیسوی میں فرانس کے دانشور اور فلسفی روسو نے منشائے عام (Public Will) کا نظریہ پیش کیا کہ اختیار کے اصل مالک عوام ہیں کیونکہ انسان خیر و شر میں خود تمیز کر سکتا ہے جس رائے پر عوام کی کثرت اعتماد کا اظہار کرے وہی معیارِ حق ہے۔

سوچنے کا مقام ہے کہ روئے کائنات پر ہندو خود تراشیدہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ یہودی حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں جب کہ نصاریٰ عقیدہ تثلیث کے قائل ہیں لیکن مسلمان اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک مانتے ہیں۔ اگر ہر انسان حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے تو خالق کائنات کی ذات و صفات سے متعلق بنی نوع انسان میں اختلاف کیوں ہے؟

اللہ ذوالجلال نے بنی نوع انسان کی ہدایت و راہ نمائی کے لیے انبیاء کرام مبعوث فرمائے، یہودیوں میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کرام کی بعثت کا تصور موجود ہے۔ نصاریٰ ان کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نبی تسلیم کرتے ہیں۔ اگر انسان سیدھے اور ٹیڑھے راستہ میں پہچان کر سکتا تھا تو انبیاء کرام کی بعثت کا کیا مقصد تھا؟

عالمی معاشرہ میں قتل و غارت، چوری ڈکیتی اور بدکاری کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہر انسان خود خیر و شر میں تمیز کر سکتا تو معاشرہ میں اخلاقی جرائم کا ارتکاب کیوں ہے؟

جانوروں کی افزائش نسل کے لیے نر اور مادہ کا ملاپ ضروری ہے۔ اگر ایک نر دوسرے نر اور ایک مادہ دوسرے مادہ سے ملاپ کرتے رہیں تو یہ افزائش نسل کا سبب نہیں بن سکتا۔ اہل مغرب کے قانون ساز ادارے یکے بعد دیگرے ہم جنس پرستی کے عمل کو قانونی جواز فراہم کر رہے ہیں۔ اہل مغرب اپنے پیکج کو دوسرے ممالک میں بزور قوت رائج کر رہے ہیں۔ توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ اس طرح افزائش نسل کا تولیدی سلسلہ جاری رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا نظریہ منشائے عام فطرت انسانی کے مطابق ہے؟

اہل مغرب کے کروڑوں افراد بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تین چار صد نمائندوں کا انتخاب کرتے

ہیں جو حکومتی نظام چلانے کے لیے دستور تشکیل دیتے ہیں اور معاشرہ میں جرائم کے خاتمہ کے لیے بحث و مباحثہ کے بعد منشائے عام کی بنیاد پر قانون وضع کرتے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ اس کے نقائص ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہی ارکان اسے تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ کو ردو بدل اور ترمیم کرنے کا اختیار اس امر کا بین ثبوت ہے کہ انسانوں کے بنائے ضابطے اور قانون نقائص سے پاک نہیں ہو سکتے۔ جب سے اہل مغرب نے وحی الٰہی کے احکام کو پس پشت ڈال کر جرائم کے خاتمہ کے اختیارات منتخب ارکان کو سونپ دیئے تو جرائم کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔

روزمرہ زندگی کا مشاہدہ ہے کہ مشینی آلات کے مفید اور ضرر رساں پہلو کو اس کا موجد بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس پر ممکنہ جنم لینے والی خرابیوں کا ازالہ درست انداز میں کر سکتا ہے۔ اسی طرح خالق کائنات بنی نوع انسان میں ممکنہ شر انگیز اقدام کے سدباب کے لیے پابند و تابندہ ضابطے وہی تجویز کر سکتا ہے۔ اللہ رحیم و کریم نے انسانوں میں خیر و شر کی پہچان کے لیے انبیاء کرام مبعوث فرمائے جو وحی الٰہی کی روشنی میں ہدایت کا فریضہ سر انجام دیتے رہے۔ رب کائنات نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ہمہ گیر دائمی ضابطہ حیات قرآن حکیم نازل فرمایا۔ امام کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت اس کی عمدہ تفسیر ہے۔ قرآن وسنت میں قیامت تک پیش آمدہ مسائل کا حل موجود ہے۔ پندرہویں صدی کا تہائی حصہ بیت گیا ہے لیکن مذکورہ احکام میں اب تک کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ جو اسلام کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

روئے کائنات کی جس دھرتی پر وحی الٰہی کے احکام کو سپریم لاء کی آئینی حیثیت رہی تو معاشرہ میں جرائم کی شرح آٹے میں نمک کے برابر رہی۔ جب سے بنی نوع انسان نے منشائے عام کے نظریہ کو اپنایا اس وقت سے جرائم کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ عالمی معاشرہ میں امن وسلامتی کا راز خالق کائنات کے نازل کردہ قرآن وسنت کو سپریم لاء کی آئینی حیثیت دینے میں مضمر ہے۔

محمد رشید

ایمان......امن......اور طاقت

مغربی طاقتیں عالمی امن تباہ کر رہی ہیں اور الزام مسلمانوں کو دے رہی ہیں

امن انسان اور انسانی معاشرہ کی بنیادی ترین ضرورت ہے۔ انسان کے دین اور دنیا کے تحفظ، ترقی اور خوشحالی کا بنیادی ترین حصار اور پلیٹ فارم امن ہے۔ امن اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت اور نعمت بھی ہے۔ لہٰذا قرآن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت (امن) کا لازمی نتیجہ اللہ کی عبادت کی صورت میں نکلنا چاہیے (سورۂ قریش)۔ امن کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام الناس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو مکہ کی بنجر اور بے آباد زمین پر آباد کرتے ہوئے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے گھر (کعبۃ اللہ) کو تعمیر کرتے ہوئے جو اولین دعا مانگی اس کے الفاظ یہ ہیں {وَاِذْ قَالَ اِبْرٰاھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَ االْبَلَدَ اٰمِنًا} ترجمہ: اور جب کہا (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) نے اے میرے رب اس جگہ کو امن کا گہوارہ بنا دے''۔ قرآن حکیم کے نزدیک امن اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہے اس کو سورۂ نور کی آیت نمبر 55 سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اہل ایمان کو ایمان اور عمل صالح پر کاربند رہنے کے نتیجے میں زمین میں خلافت، تمکن اور امن کی بشارت دی گئی ہے۔ امن دعوتِ اسلامی کی بنیاد بھی ہے اور غلبہ اسلام کا نتیجہ بھی۔ بالفاظ دیگر سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ نوع انسانی کو اسلام کی امن و سلامتی کی دعوت پہنچانے کے لیے امن (پُرامن ماحول) نہایت بنیادی ضرورت بھی ہے اور اسلام کی حکومت و غلبہ کا مقصود بھی۔ ایک مسلمان کے نزدیک امن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں اسلام کی دعوت و اشاعت کا فریضہ بہترین طریقے سے انجام پا سکتا ہے۔ اور اسلام کی اشاعت و غلبہ کا اولین فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی کو امن کی اعلیٰ ترین حالت اور ماحول میسر آتا ہے۔

یہ بات بظاہر بڑی عجیب لگتی ہے اور سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ''امن دعوتِ اسلامی کی بنیاد بھی ہے اور غلبہ اسلام کا نتیجہ بھی''۔ اس الجھن کو بیج اور پھل کی مثالوں سے بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی بھی پودے کے بیج کو اس کے ماحاصل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سیب کا بیج سیب نہیں ہوتا، لیکن اس میں سیب بننے کی مکمل صلاحیت ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی کسان سیب کا بیج اپنے کھیتوں میں بوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے سیب بویا ہے حالانکہ سیب کا بیج نہ

تو شکل میں اور نہ ہی ذائقے میں سیب کے پھل کی خوبصورتی اور لذت اس ابتدائی سٹیج پر مہیا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔سیب کے بیج کو مکمل سیب بننے (سیب کے پھل جیسی خوبصورتی اور لذت حاصل کرنے) کے لیے کسان کو طویل صبر آزما محنت اور مسلسل نگرانی وانتظار کی کیفیتوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ پھر کہیں جا کر وہ سیب کی فصل حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ بالکل اسی مثال پر امن کی ہر دو مطلوب حالتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

''امن دعوت اسلامی کی بنیاد'' سے مراد یہ ہے کہ جس ماحول میں اسلام کی دعوت اور تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا جارہا ہو،اس ماحول میں داعی اور مدعو کے درمیان مادی حرص وطمع کی بنیاد پر کسی قسم کا ذہنی تناؤ،تعصب،عناد،مخالفت اور قتل وغارتگری کا بازار گرم نہیں ہونا چاہیے۔داعی اور مدعو کے درمیان مادی مفادات اور دیگر تعصّبات کی جنگ دعوت کے ماحول کو مکمل طور پر برباد کرکے رکھ دیتی ہے۔داعیان اسلام کی آخری حد تک یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مدعو اقوام کی حیوانی جبلتوں کو انگیخت اور مشتعل کیے بغیر ان کے دل اور دماغ کو متاثر کرنے اور شرک وکفر اور نفس پرستی کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے اللہ کی مخلوق کے لیے مکمل طور پر پیکر خلوص ومودت بن جائیں۔

سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب دعوت کا ماحول اس حد تک خراب کردیا جائے کہ مدعو قوم کے طاقتور سربراہان اور سرکردہ لوگ داعی کی ذات اوراس کی دعوت کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر کمربستہ ہوجائیں تو انسانیت کے سب سے بڑے ہمدرد اور خیر خواہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوہ حسنہ یہ ہے کہ دعوت کے میدان کو تبدیل کرلیا جائے اور ایسی مکمل بدامنی اور فساد کی جگہ سے داعی ہجرت کرجائے۔ہجرت درحقیقت ''امن'' کے اس بیج کے لیے موافق زمین کی تلاش کا نام ہے، جو دعوت اسلامی کی بنیاد ہے اور اسلام کی تعلیمات کے پھیلاؤ اور قیام سے ''امن'' کا یہ بیج اپنی کامل ''خوبصورت اور لذیذ'' پھل کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن ابلیس (شیطان) ہے۔لہٰذا امن کا سب سے بڑا دشمن بھی ابلیس (شیطان) ہی ہے۔ابلیس کی ازل سے یہ تکنیک رہی ہے کہ دنیا میں خوف، دہشت،فساد اور بدامنی برپا کرکے انسان سے اپنی ازلی دشمنی اور رقابت کا اظہار کیا جائے۔تاکہ انسان نہ دنیا کا رہے اور نہ آخرت کا۔گویا انسان کی دنیا اور آخرت برباد کرنا ابلیس کا سب سے بڑا مشن ہے۔ایسا نہیں ہوتا کہ ابلیس اپنی کالی سیاہ مردود شکل میں دنیا میں نمودار ہوتا ہو اور دنیا میں فساد وخونریزی برپا کرنا شروع کردیتا ہو......نہیں بلکہ وہ وسوسہ انگیزی کی نہایت طاقتور اور خوبصورت دلیلوں کی قوت کے ذریعے سے انسانوں میں سے

اپنے پیروکار بناتا ہے۔جنہیں توحید کی بجائے شرک اور لامذہبیت سے زیادہ پیار ہوجاتا ہے،جنہیں حسد، تکبر،انانیت اور طاقت کا نشہ سراپا ابلیس بنادیتا ہے۔جو انسانوں پر جھوٹے خداؤں کی خدائی قائم کرنے کے لیے اور انسانوں پر انسان کی خدائی قائم کرنے کے لیے خوف اور خون ریزی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں،اور وتہذیب وتمدن کے نام پر انسانیت کو شقاوت،بدبختی،بے حیائی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں لاکھڑا کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے طاقت کا اندھا اور بے رحم استعمال کرتے ہیں۔

انسانی تاریخ آدم وابلیس کے پیروکاروں کے ٹکراؤ سے بھری پڑی ہے۔انسانیت کو امن،سلامتی، دنیا وآخرت کی ابدی کامیابیوں کی دعوت دینے والے اور انسان کا اس کے رب سے تعلق جوڑنے والے آدم کے پیروکار ہیں تو دوسری طرف اولاد آدم کے امن وسلامتی کو برباد کرنے والے اور آدمیت کے مشن (ابدی امن اور ابدی سلامتی بذریعہ اطاعت ورضائے الٰہی) کے بدترین دشمن ابلیس کے پیروکار ہیں۔ہر دور میں آدم علیہ السلام کے پیروکار دنیا میں امن،سلامتی اور خالق ومالک کی بندگی کا ماحول بناتے رہے ہیں تو ابلیس کے پیروکار ''امن وبندگی'' کے اس ماحول کو نیست ونابود کرتے رہے ہیں۔

تاریخ انسانی میں ابلیس کے مشن اور ابلیس کے پیروکاروں پر سب سے کاری ضرب خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے لگائی۔چنانچہ تاریخ انسانی میں پہلی بار ابلیس اور ابلیسی قوتوں کو بدترین شکست سے دوچار کرتے ہوئے قیامت تک کے لیے امن وسلامتی کے منبع وسرچشمہ (اسلام) کو قائم اور Establish کرکے دکھادیا۔ابلیس اور اس کے پیروکار اپنی اس شکست پر نہایت غضبناک ہوگئے اور انتقام کی آگ بھڑکاتے چلے گئے۔چنانچہ تاریخ انسانی میں پہلی بار ابلیس کے پیروکاروں کی دہشت گردی کا شکار نبی رحمت ﷺ کا وہ خلیفہ ہوا جسے دنیا عمرؓ ابن خطاب کے نام سے جانتی ہے اور جس نے دنیا کو عدل،انصاف اور امن وسلامتی کا ایسا خوبصورت ترین ماڈل ویلفیئر سٹیٹ کی شکل میں دیا،جس کی روشنی اکیسویں صدی تک کے انسانوں کو بھی مسحور کرکے رکھ دیتی ہے۔چنانچہ ابلیس کے پیروکار انسانیت کے اس عظیم محسن پر عین حالت نماز (امن کی اعلیٰ ترین حالت میں) خودکش دہشت گردانہ حملہ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی شہادت واقع ہوتی ہے۔اسلام اور محمد ﷺ کے خلاف ابلیس کی آتش انتقام اس کے باوجود ٹھنڈی نہیں ہوتی۔چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے داماد اور تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھی عین تلاوت قرآن کی حالت میں شہید کروادیا جاتا ہے۔اور پھر رسول اکرم ﷺ کے داماد اور چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی دہشت گردانہ حملے میں شہید کردیا جاتا ہے۔

اسلام کو اپنے اولین دور سے دہشت گردی کے ناسور کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اور اس دہشت گردی

کی لعنت کے نتیجے میں اسلام کے تین بہترین ایسے حکمران (خلفائے راشدین) شہید ہو گئے جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی بہترین اور محبوب ساتھی بھی تھے۔ نہایت حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دہشت گردی کے نتیجے میں اتنی بڑی شہادتوں کو بنیاد بنا کر خلافت اسلامیہ نے آدھی سے زیادہ غیر مسلم دنیا کو تباہی، بربادی اور نہ ختم ہونے والی دہشت گردی کے عذاب میں مبتلا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے بعد دنیا کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب وحی حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ خلافت کا نہایت پُرامن اور مستحکم دور عطا کیا۔ اس کے بعد بنوامیہ اور بنوعباس کی باہمی چپقلش اور عداوت کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والے افسوسناک اور اندوہناک واقعات اور خرابیوں کے باوجود بنوامیہ اور بنوعباس کے کم وبیش چھ سو سال پر محیط دور خلافت کی سب سے بڑی اور اہم ترین قدر امن اور انصاف رہی ہے۔ اندلس میں خلافت بنوامیہ اور بغداد میں خلافت بنوعباس کے سقوط وزوال سے دوچار ہونے کے بعد خلافت عثمانی کے کم وبیش پانچ سو سال اور ہندوستان میں مغل سلطنت کا طویل دور اسلام کا مثالی دور نہ سہی مگر ان تمام ادوار میں ابلیسی پیروکار انسانی معاشروں کو فساد اور خونریزی کی بھیانک اور اندھی شکل ''دہشت گردی'' میں مبتلائے عام کرنے کے مشن میں مجموعی طور پر ناکام رہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی تمام تر کمزوریوں اور خطاؤں کے باوجود ابلیسی پیروکاروں کو کبھی اس حد تک سر اٹھانے کی اجازت نہ دی کہ وہ انسانی معاشروں کو دہشت گردی کے بدترین جذام میں مبتلا کر ڈالیں۔

خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت کے سقوط وزوال کے بعد بیسویں صدی میں ساری دنیا میں قرآن وسنت کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے امکان تک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور پوری دنیا میں مغربی طاقتوں کی حکمرانی اور قوت کا ڈنکا بجنے لگا۔ چنانچہ مسلم ممالک بھی ایک ایک کر کے مغربی طاقتوں کی غلامی میں آتے چلے گئے۔ ایک خاص عرصے تک مسلم ممالک کو غلام رکھنے کے بعد مغربی قوتوں نے اگرچہ غلامی کا ظاہری قلاوہ تو مسلمانوں کی گردنوں سے اتار کر بظاہر مسلم ممالک کو آزادی دے دی مگر پس پردہ اسلامی اقدار کے معاملے میں ''بے یقین''، مگر مغرب کی پُرفریب دجالی طاقت پر یقین رکھنے والے آلہ کار مسلم حکمرانوں کے ذریعے سے اپنے اقتدار کو قائم ودائم رکھا۔

ساری دنیا پر مغرب کی Secular-cum-Christian بلاشرکت غیرے حکمرانی کو سو سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ مغرب ایک سو سال سے زائد عرصے سے امن وسلامتی اور آزادی وخوشحالی کے نہایت خوشنما نعروں اور وعدوں کے ذریعے ساری دنیا پر اپنی حکمرانی کو جواز فراہم کرتا آ رہا ہے۔ لیکن ان نہایت پُرفریب نعروں کے باوجود نہایت حیرت انگیز طور پر پچھلے سو سالوں میں دنیا امن، سلامتی، آزادی اور خوشحالی وروشن خیالی کی قدروں سے محروم ہوتی چلی گئی ہے۔ مغرب کی سو سالہ حکمرانی کے نتیجہ

میں انسانیت کو جو سب سے بڑا تحفہ ملا ہے اس کا نام ہے ''دہشت گردی''۔ اور اکیسویں صدی کا انسان جس چیز سے سب سے زیادہ دور ہے وہ ہے ''امن''۔

ظلم، دہشت گردی، فساد، انارکی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف اسلام کے فیصلہ کن اور طاقتور ترین عقائد، عبادات اور سیاسی، معاشی و معاشرتی اقدار کا توڑ ابلیس کے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ اس نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی اسلام کے صالح عقائد، عبادات اور سیاسی، معاشی و معاشرتی اقدار سے وابستگی میں دراڑیں ڈال دیں (زوال کا یہ سفر کئی صدیوں پر محیط ہے، جو انیسویں صدی میں بدترین سطح پر پہنچ گیا) نتیجۃً مسلمان معاشروں کو بدترین داخلی فساد سے دوچار کر دیا تو دوسری طرف ساری دنیا کے اسلام دشمن، حیاباختہ اور امن و انصاف کے لٹیروں کے ہاتھوں میں جمہوریت، لادینیت، آزادی اور روشن خیالی کا علم تھما دیا۔

ایک مسلمان دنیا میں اللہ کی اطاعت کا سب سے بڑا داعی ہوتا ہے۔ لیکن بیسویں اور اکیسویں صدی میں ایک ارب کے قریب مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت من حیث المجموع اللہ سے بغاوت اور نافرمانی کی داعی بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو صدیوں میں امت مسلمہ اقتدار، قوت اور عزت سے محروم ہو چکی ہے۔ جب مقابلہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار اور باغی گروہوں میں ہو تو آخری فتح لازماً اللہ کے وفادار بندوں کی ہوا کرتی ہے۔ لیکن جب نام نہاد مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کے باغی بن چکے ہوں اور دنیا میں عزت، اقتدار اور غلبہ وہ اللہ کی محبوب اور پسندیدہ قوم کا سا حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ذلت مسکنت اور بربادی ان پر تھوپ دی جاتی ہے۔ یہ نام نہاد مسلمان جب Designation مسلمان (اللہ کی اطاعت و وفاداری) کا استعمال کرتا ہو لیکن دنیا میں جھوٹ، خیانت، بے حیائی، حرام خوری اور حرام کاری (اللہ سے بغاوت) کے میدانوں میں یہ کافروں (اللہ کی بغاوت کا designation استعمال کرنے والوں) کو بھی پیچھے چھوڑ جائیں اور اپنی اجتماعیت اور نمائندگی کے لیے صالح اور باصلاحیت افراد کو سربراہ منتخب کرنے کی بجائے جھوٹے، دھوکہ باز، اللہ و رسول کے باغی اور کافر قوموں کے درپردہ وفادار افراد کو منتخب کریں تو اللہ تعالیٰ کا غضب اور لعنت اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اللہ کے غضب اور لعنت میں گھِری ہوئی امت مسلمہ کی ترجیح خودکار طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ دنیا میں خدا کی نمائندگی اور وفاداری کا designation (مسلم) تو بڑے فخر سے استعمال کرتی ہے لیکن ''اللہ کی طرف دعوت'' اس کی اولین ترجیحات میں سے نکل کر بہت پیچھے کہیں جا کر چھپ جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر مقابلہ کے

میدان میں جب اللہ کے دو باغی گروہ ہوتے ہیں، ایک نام نہاد مسلمان (جعلی اور جھوٹا باغی) گروہ اور دوسرا غیر مسلم (اصلی اور سچا باغی) گروہ تو دنیا فساد اور بدامنی کی بدترین آماجگاہ بن جاتی ہے، جیسا کہ اس وقت دنیا بن چکی ہے۔ اس صورتحال میں ''بغاوت'' کے جعلی اور جھوٹے علمبرداروں (مسلمانوں) پر اصلی اور سچے علمبرداروں (کفار) کا غلبہ اور اقتدار اللہ تعالیٰ کے اٹل وعدوں اور اس کے قانون فطرت کے عین مطابق ہے۔

اسلام اور مشرق ومغرب کے تمام انسانوں کے دشمنوں کو ظہور اسلام کے بعد پہلی بار بیسویں صدی میں پوری دنیا پر غلبہ حاصل ہوگیا۔ (۱) ساری دنیا کی دولت پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ (۲) تاریخ انسانی میں پہلی بار انتہائی ہولناک اور دہشت ناک ترین جنگی ٹیکنالوجی پر ان کو بلاشرکت غیرے اجارہ داری حاصل ہوگئی۔ (۳) ذرائع ابلاغ میں انتہائی حیرت ناک اور تیز ترین ایجادات وٹیکنالوجی پر ان کو عبور حاصل ہوگیا۔ یہ تین وہ بہت اہم قوتیں ہیں جن کے ذریعے سے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کو چند لمحوں میں یا زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں میں بدترین شکست دی جاسکتی ہے۔

ایک عام سوچنے سمجھنے والے آدمی کے لیے یہ بات یقینا حیرت کا باعث بنتی ہے کہ انسانیت کا ایک ایسا گروہ جو دنیا میں آزادی، انصاف، انسانیت، امن، جمہوریت اور مذہبی آزادی کا زبردست علمبردار ہے اور امن کی بڑی سے بڑی دشمن طاقت کو بھی وہ چند لمحوں میں نیست ونابود کرسکتا ہے۔ اور پچھلے کم وبیش ڈیڑھ دو صدیوں سے ساری دنیا پر بھی اسی گروہ کا غلبہ ہے، تو پھر مشرق ومغرب کا انسان تاریخ انسانی میں پہلی بار سب سے زیادہ بدامنی اور دہشت گردی کا شکار کیوں ہے؟ سب سے زیادہ ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا شکار کیوں ہے؟ فکر وکردار کے معاملے میں قلاش کیوں ہو چکا ہے؟ ساری انسانیت کو فکر معاش کے خوف میں گرفتار کر کے اس کی صلاحیتوں کا، اس کے اوقات کا، اس کے افکار، اور اس کی آزادی کا بدترین استحصال کیوں کیا جارہا ہے؟ جمہوریت جسے امن کی سب سے بڑی طاقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کے ذریعے سے مالدار، بدکار، غنڈہ گرد، رسہ گیر، ظالم، لٹیرے، غریبوں کا خون چوسنے والے اور صرف امیروں کی جان، مال اور حقوق ومفادات کا تحفظ کرنے والے عناصر کیوں غالب آجاتے ہیں؟ ترقی یافتہ اقوام وممالک ساری دنیا کو امن کی دولت بانٹنے کی بجائے بدامنی اور دہشت گردی کا خوف کیوں بانٹ رہے ہیں؟

اس سوال کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ امن قائم کرنے کے لیے جس طاقت اور قوت کی ضرورت ہوا کرتی ہے، جدید دنیا میں اس طاقت اور قوت کا بلاشرکت غیرے مالک مغرب کا وہ شیطانی

ٹولہ بن چکا ہے، جس کا مقصد آخری حد تک انسانیت کی تباہی و بربادی ہے۔ یہ وہ ٹولہ ہے جس نے خود مغرب میں کئی سو سال تک مذہب کے پاکیزہ نام کو بدترین خون ریزی، نہ ختم ہونے والی فرقہ وارانہ ونسلی تباہی اور دہشت وخوف کی بدترین انتقامی کاروائیوں کے لیے استعمال کیا۔ اس شیطانی ٹولے نے حضرت مسیح علیہ السلام کے پاکیزہ نام پر یورپ کی عیسائی اقوام میں تباہی اور دہشت کی بدترین تاریخ رقم کی۔ یہی شیطانی ٹولہ اندلس کے مسلمانوں کی بدترین نسل کشی میں ملوث رہا، اسی ابلیسی گروہ نے براعظم امریکہ کے دس کروڑ انسانوں کی بدترین نسل کشی کی۔ اور یہی شیطانی وابلیسی ٹولہ جمہوریت اور آزادی کے خوبصورت عنوانات کی آڑ میں آج ساری دنیا کو بدترین تباہی، خون ریزی، دہشت گردی اور فساد میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ یہی شیطانی وابلیسی ٹولہ جمہوریت اور آزادی کے خوبصورت لبادہ میں اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن بنا ہوا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کی اکثر سیاسی قیادتیں، بعض نام نہاد مذہبی دانشور دانستہ اور عوام کی عظیم اکثریت نادانستہ اس دہشت گرد، انسانیت دشمن ابلیسی ٹولے کے ذہنی غلام، مطیع اور فرمانبردار بنے ہوئے ہیں۔

کرنے کا اصل کام: امن کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کا راستہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ مسلمان قرآن اور سیرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو مشعل راہ بناتے ہوئے ''ایمان اور اخلاق'' کی قوی ترین روشنی سے نہ صرف اپنی زندگی کے اندھیروں کو روشن کریں بلکہ ''ایمان اوا خلاق'' کی پاکیزہ ترین روشنی سے ساری انسانیت کی زندگیوں کے اندھیروں کو دور کرنا اپنی زندگیوں کا مشن بنالیں۔ دوسرے لفظوں میں مسلمان نہ صرف خود مجسم اطاعت اور سلامتی بن جائیں بلکہ اللہ کی اطاعت اور سلامتی والی زندگی کی طرف مخلصانہ پکار لگانے والے بھی بن جائیں۔

انسانیت کو کامل تباہی اور بربادی سے بچانے کا یہی واحد لائحہ عمل ہے۔ یہ ہم مسلمانوں کا فرض منصبی بھی ہے اور دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں امن کی اعلیٰ ترین نعمت کے حصول کی شرط لازم بھی۔ ہم مسلمانوں کی مجرمانہ غفلت اور دین سے بغاوت کے نتیجے میں انسانیت جس بدترین تباہی اور بربادی سے دوچار ہے، اس سے انسانیت (اور خود مسلمانوں) کو نکال کر امن کی شاہراہ پر چلانے کے لیے یہی ''کرنے کا اصل کام'' بھی ہے۔

قوموں کی باہمی آویزش اور اسلام: اپنے اس فرض منصبی اور ''کرنے کا اصل کام'' کی پیہم ادائیگی کے ساتھ ساتھ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوموں کی باہمی آویزش اور ایک دوسرے کے ساتھ ظلم وزیادتی پر ہم بطور داعی کس ردعمل کا اظہار کریں؟ صورتحال کا حیرتناک پہلو یہ ہے کہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں

''قوموں کی باہمی آویزش'' کے اس منظرنامے میں دنیا کی تقریباً تمام غیر مسلم قوتیں اور قومیں قاہر اور ظالم بنی ہوئی ہیں تو ''مسلمان قوم'' ان تمام ظالم اور قاہر قوتوں کا تر نوالہ بنی ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے ''امن اور سلامتی'' کے طاقتور ترین حصار (اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت) سے نکل کر امن قائم کرنے کی اپنی قوت اور طاقت کو خود ہی گنوا دیا۔ اور اس طرح نہ صرف اپنی بلکہ انسانیت کی تباہی و بربادی کا چوپٹ دروازہ کھول دیا۔ تاہم اس تلخ حقیقت کے اظہار کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کی ظالم دجالی قوتیں اور شریر عالمی طاقتیں لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی جان، مال، عزت وآبرو اور ان کے وجود ہی کو مٹانے کے در پے ہو جائیں تو بحیثیت ''داعی'' ہم اس کھلی دہشت گردی پر آنکھیں بند کر لیں اور بجائے ظالم شریر دجالی قوتوں کے خلاف کلمہ حق کہنے کے، ان دجالی قوتوں کے مقاصد کے حصول میں مکمل معاونت اور وفاداری کا اظہار کرنے والے بے ضمیر اور بے غیرت مسلمانوں کو تو کچھ نہ کہیں مگر ان کے فسادی اور دہشت گردانہ ہتھکنڈوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے باغیرت اور باضمیر مسلمانوں کے خلاف ہماری زبان طعن دراز ہوتی چلی جائے۔

بطور داعی اپنے اصل فرض منصبی اور ''کرنے کا اصل کام'' کی مسلسل اور پیہم ادائیگی میں ذرا سی بھی لغزش لائے بغیر اور حصول امن کی شدید خواہش کے باوجود فلسطین، کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، کوسوو، میانمار، الجزائر، عراق، افغانستان اور اب شام اور مصر میں عالمی استعماری دجالی قوتوں کے دہشت گردانہ عزائم کی مذمت اور ان دہشت گردانہ حملوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے خوددار، باضمیر اور باغیرت مسلمانوں کی حمایت ہمارا اخلاقی، ایمانی اور دینی تقاضا ہے۔ یہ وہ کلمہ انصاف ہے جس کی مخالفت داعی کی زندگی کو ایک مفلوج، مجہول اور مکروہ زندگی بنا کر رکھ دیتی ہے۔

یہ ایک بنیادی بات ہے کہ داعی کی زندگی ''امن اور سلامتی'' کا ایک زندہ پیغام ہونی چاہیے اور مدعو اقوام سے نسلی، مادی، علاقائی، لسانی اور تمام قسم کے جاہلی تعصّبات کی بنیاد پر عداوت اور عناد کو کسی صورت اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ داعی انسانیت کے لیے دنیا میں امن کا سفیر ہوتا ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی دو بڑی پہچانیں بن چکی ہیں ایک بطور ''داعی'' اور دوسری بطور ایک ''قوم''۔ قرآن وسنت پوری شدت اور اصرار سے مسلمانوں کی بطور ''داعی'' (امت) شناخت کرانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے برعکس ابلیس اور ابلیسی قوتیں مسلمانوں کی بطور ''قوم'' (فرقہ) شناخت پر اصرار کرتی ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت ابلیس کے بہکاوے میں آ کر بطور ''قوم'' (فرقہ) اپنی شناخت پر

مطمئن ہو چکی ہے۔ ابلیس جانتا ہے کہ مسلمانوں کی بطور داعی (امت) شناخت انسانیت کے لیے امن اور سلامتی کا ایک عظیم پیغام ہے۔ جبکہ ابلیس انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ لہٰذا انسانیت کو تباہی و بربادی سے دوچار کر کے امن و سلامتی کی آخری امید کا بھی خاتمہ کر دینا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں کی بطور داعی شناخت کا خاتمہ اور بطور ایک حریف ''قوم'' بنا کر اور دیگر اقوام کو اس سے لڑوا کر مسلمانوں کے اور انسانیت کے وجود ہی کا خاتمہ ابلیس کا مشن ہے۔ چنانچہ عالمی دجالی طاقتوں کے ذریعے اس ابلیسی مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی آخری حد تک کوششیں ہو رہی ہیں۔

مسلمانوں کے وجود کے دو بڑے دشمن ہیں یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے وجود کو مٹانے والے دو بڑے عوامل ہیں: ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی عنصر یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن اور سنت رسول ﷺ کو بطور اتھارٹی اور قوت محرکہ خارج کر دیں۔ مسلمان دنیا میں انسانیت کے لیے امن اور رحمت (ایمان اور اخلاق) کی ٹھنڈی چھاؤں بننے کی بجائے اخلاق و کردار کے افلاس کا شکار ہو جائیں اور زندگی کے مادی و جاہلی جھگڑوں میں دوسری اقوام سے رقابت اور دشمنی کو اپنی پہچان اور شناخت بنا لیں۔ یہ وہ داخلی عنصر ہے جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کے وجود کے لیے بھی ایک عظیم خطرہ ہے۔ مسلمانوں کے وجود کو مٹانے والا دوسرا بڑا عنصر خارجی ہے۔ یعنی غیر مسلم اقوام کے شریر، ظالم اور ابلیس کے آلہ کار دجالی حکمران عالمی طاقتوں کی شکل میں فلسطین، کشمیر، چیچنیا، عراق، افغانستان، الجزائر، افریقہ اور اب شام و مصر وغیرہ میں مسلمانوں کی آزادی، آزادی رائے اور ان کے وجود کو مٹانے کے لیے بدترین ریاستی و غیر ریاستی دہشت گردیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ جس کے ردعمل میں ان ہی علاقوں کے مردان احرار (آزادی کے متوالے) اسلام کے جذبہ جہاد و شہادت سے روشنی حاصل کرتے ہوئے ابلیس کی عالمی دجالی قوتوں کے خلاف مزاحمت کی ایک عظیم اور حیران کن تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ بیسویں اور اب اکیسویں صدی کے یہ گناہگار مسلمان عالمی دجالی عزائم کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو رہے ہیں۔ ایک سچے داعی کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کے ''داخلی روحانی وجود'' کو مٹانے والے داخلی عوامل (معصیت و فسق) کے خلاف کلمہ حق بلند کرے اور داخلی طور پر پائے جانے والے اس عظیم فساد کو امن میں بدلنے کے لیے اصلاح کی اپنی استطاعت بھر کوشش کرے، بلکہ امت مسلمہ کے ''خارجی مادی وجود'' کو مٹانے والے خارجی عوامل (استعماری طاقتوں کے کمزور مسلمانوں پر دہشت گردانہ حملوں) کے خلاف بھی کلمہ حق بلند کرے اور خارجی سطح پر پائے جانے والے اس بھیانک فساد کو بھی امن میں بدلنے کے لیے اصلاح کی اپنی استطاعت بھر کوشش کرے۔

تصویر کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ عالمی دجالی طاقتوں کا جہاں جہاں بس چلتا ہے وہ نہ صرف خارجی

سطح پر مسلمانوں کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے اسلحہ اور جنگ کا ذریعہ استعمال کرتے ہیں بلکہ داخلی سطح پر مسلمانوں کے وجود کو مٹانے کے لیے مسلمانوں کے دوست بن کر، انکے ہمدرد اور خیر خواہ بن کر میڈیا، کیبل، انٹرنیٹ، موبائل، تعلیم، کھیل حتیٰ کہ تفریح تک کو مسلمانوں کے ’’ایمان واخلاق اور کردار‘‘ کی بیخ کنی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ داخلی سطح پر ابلیس کا یہ وہ بھیانک حملہ ہے، جسے ہم دوستانہ کھیل سمجھ کر دل وجان سے اس کے آگے بچھے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ملی وجود کو مٹانے کے اس ’’داخلی حملہ‘‘ کے خلاف کوئی قابل ذکر اور متاثر کن جوابی کاروائی پورے عالم اسلام میں کہیں دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ سوائے اس کے کہ چند ٹوٹی پھوٹی تبلیغی، تدریسی، تعلیمی، غلبہ دین کے عنوان سے دعوتی اور سیاسی سرگرمیاں ہمارے لیے بالعموم محض ذہنی عیاشی اور ’’مذہبی نشہ‘‘ کی تسکین کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ابلیس اور اس کے آلہ کاروں کو عالم اسلام کی ان ٹوٹی پھوٹی کاوشوں سے بھی ہر دم دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ کھوٹ اور دورنگی سے پاک ہو کر خالصتاً آخرت رخی، للّٰہیت اور حسن کردار کی دولت سے مالا مال نہ ہو جائیں۔ اسی لیے ابلیس ان تحریکوں کو مزید قال مست وحال مست اور De-track کرنے کے لیے اپنی تمام منفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ تاہم مسلمانوں کے ملی وجود کو مٹانے کے لیے ابلیسی اور دجالی قوتوں کے خارجی حملہ (بذریعہ اسلحہ اور جنگ) کا سامنا مسلمانوں کو دنیا کے جس کسی بھی علاقے میں کرنا پڑا ہے (داخلی حملہ کے برعکس) مسلمانوں نے اس خارجی حملہ کے خلاف شدید مزاحمت کی اور حیران کن مدافعانہ جنگ لڑی ہے۔ خاص طور پر افغانستان کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والی تین عالمی دجالی طاقتوں کو بیسویں اور اکیسویں صدی کی اعلیٰ ترین جنگی ٹیکنا لوجی اور فتح کے تمام وسائل دستیاب ہونے کے باوجود بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ابلیس کی آلہ کار دجالی وشیطانی طاقتیں اپنی اس ذلت آمیز شکست کا بدلہ ابلیس کے ’’داخلی حملہ‘‘ کا آسان شکار بننے والی مسلمان طاقتوں اور ’’خارجی حملہ‘‘ کے خلاف کامیاب دفاع اور مزاحمت کرنے والی مسلم طاقتوں کو باہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر لینا چاہتی ہیں اور اس طرح اپنے شیطانی نفس کی تسکین کرنا چاہتی ہیں۔

امن کے داخلی محافظ (ایمان) کے علمبردار پوری دنیا کے میدانی اور تمدنی علاقوں کی وہ اسلامی، دینی، قرآنی تبلیغی اور دعوتی جماعتیں ہیں جو اپنی تمام تر کوتاہیوں، کمیوں اور خامیوں کے باوجود قرآن اور سنت کی دعوت کو عام کر رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح امن کے خارجی محافظ (طاقت) کے علمبردار مسلم افواج کے علاوہ دنیا کے پہاڑی، صحرائی اور قبائلی علاقوں کے وہ مسلح مسلم قبائل ہیں جو اپنی تمام تر کوتاہیوں، کمیوں اور خامیوں کے باوجود عالمی دجالی قوتوں کے مسلح جارحانہ دجالی حملوں کا براہ راست مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں۔

عالمی دجالی طاقتوں کی انتہائی کوشش اور خواہش ہے کہ مسلم ممالک کی افواج اور پہاڑوں پر بسیرا کرنے والے مسلم قبائل ہر دو کو آپس میں لڑا کر پاش پاش کر دیا جائے۔ امن کے سفیر اور ایمان و اخلاق کے داعی کی حیثیت سے مسلم جماعتوں کا یہ اجتماعی فرض بنتا ہے کہ اس امکانی خانہ جنگی کی روک تھام کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ ہماری دینی، ایمانی، انتظامی اور سماجی ضرورت ہے کہ امن کے ''خارجی محافظ'' کے ان دونوں ستونوں ''مسلم مسلح افواج'' اور ''مسلم مسلح قبائل'' کے ٹکراؤ کی مخالفت اور حوصلہ شکنی کی جائے۔

امت مسلمہ کے داعیانہ منصب کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے ''ایمانی وجود'' پر ابلیسی دجالی عالمی طاقتوں کے ''داخلی حملوں'' کے آگے شرمناک شکست قبول کرنے والے مسلمانوں کو اس ذلت وضلالت کی زندگی سے نکالنے کے لیے ہماری تمام دینی، دعوتی اور تبلیغی جماعتیں ''تزکیہ وتذکیر'' پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کر دیں اور انہیں ابلیس اور نفس کی غلامی سے نکالنے کے لیے قرآن وسیرت کی روشنی میں ''انذار وتذکیر'' کا فریضہ سرانجام دیں۔ بالکل اسی طرح ہوشمند مسلمانوں کے داعیانہ منصب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے ''مادی وجود'' کو مٹانے کی غرض سے ابلیسی دجالی عالمی طاقتوں کے ان پر کیے جانے والے مسلح ''خارجی حملوں'' کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والی اور بعض علاقوں میں اس مسلح دجالیت کو شرمناک شکست سے دوچار کرنے والی ''مسلم مزاحمتی قوت'' کو اسلام، انسانیت اور مسلمانوں کا دوست سمجھیں۔ واضح رہے کہ ابلیس کی آلہ کار دجالی قوتوں کے مسلح ''خارجی حملوں'' کے خلاف کامیاب اور حیرت انگیز مزاحمت کرنے والی اس ''مسلم مزاحمتی قوت'' کی تحقیر، استہزاء اور مخالفت درحقیقت ابلیس ہی کے دجالی مشن کی بالواسطہ یا بلاواسطہ معاونت اور مدد کرنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ دانستہ یا نادانستہ ''دعوت اور امن'' کی آڑ میں مسلح دجالی قوتوں سے نبرد آزما اس ''مسلم مزاحمتی قوت'' کا استہزا وانکار کر رہے ہیں، وہ درحقیقت نہ اسلام کے دوست ہیں اور نہ امن کے۔ کیونکہ ایمان ''امن'' کا داخلی محافظ ہے تو طاقت اس کا خارجی محافظ۔